پریم چند

حیات اور فن

www.taemeernews.com

پریم چند

حیات اور فن

اصغر علی انجینئر

एन सी ई आर टी
NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

www.taemeernews.com

ستمبر 1981
بھادوں 1903

P.D. 2T.M H

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ 1981

سرورق "منشی پریم چند : زندگی اور فکر و فن نمائش" کا ایک میورل
عمل : سی۔ بی۔ پرگنیا۔

(PREMCHAND)

قیمت : 11.80

شری وی۔ کے۔ پنڈت، سکریٹری نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، سری اروندو مارگ، نئی دہلی 110016 نے جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرس، 315 جامع مسجد، دہلی 110006 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ سے شائع کیا۔

www.taemeernews.com

پیش لفظ

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ نے زائد نصابی کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے تاکہ نوعمر طلبہ کو ہندوستان کے بیش قیمت تہذیبی و ادبی اثاثے اور عالموں، بناءروں قومی رہنماؤں، مذہبی و سماجی مصلحوں اور ادیبوں کی خدمات سے روشناس کرایا جا سکے۔ کونسل اس سلسلے کی بہت سی کتابوں کے اردو ترجمے جیسے "سر سیّد احمد خاں"، "میگھناد ساہا"، وغیرہ اور کچھ تصنیفات جیسے "امیر خسرو"، "اقبال" اور "ہمارے انیس" وغیرہ پہلے بھی شائع کر چکی ہے۔ پیشِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کا ایک حصّہ ہے، اور یہ اردو، ہندی کے مشہور ادیب پریم چند کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق ہے۔ پیشِ نظر کتاب کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی ایک ایک زائد نصابی کتاب اس عظیم ادیب کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ان کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع کی جا رہی ہیں۔

اردو ہندی ادب کی تاریخ میں منشی پریم چند بہت اہم مقام رکھتے ہیں، پریم چند نے پہلی مرتبہ ہندوستان کی دیہی زندگی کو اس کے صحیح پس منظر کے ساتھ پیش کیا اور اپنے ادب کا رشتہ راست طور پر عوام سے جوڑا۔ پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ملک کی جدوجہد آزادی میں بھی نمایاں حصّہ ادا کیا۔ ان کی تحریروں سے ہماری فکر کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

کونسل شری اصغر علی انجینئر کی بے حد شکر گزار ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو تصنیف کیا۔ کونسل جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر نامور سنگھ اور دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر قمر رئیس کی شکر گزار ہے جنہوں نے مختلف مرحلوں میں پریم چند کے بارے میں اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والی زائد نصابی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں مشیر کی حیثیت سے رہنمائی اور تعاون دیا۔ کونسل ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن حکومتِ ہند اور شری راج نارائن رآز ایڈیٹر "آج کل" کی بھی شکر گزار ہے جن کی معرفت ہمیں پریم چند اور اُن سے متعلق چند نایاب تصاویر حاصل ہو سکیں۔

میں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی کماری ایس۔ کے۔ رام، شری این۔ کے۔ سنگھ، شری ارجن دیو اور شری مجتبیٰ حسین کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کے لیے کام کیا۔ امید کی جاتی ہے کہ پریم چند صد سالہ تقریبات کے موقع پر ہندوستان کے اس عظیم ادیب کے تئیں کونسل کے اس خراجِ عقیدت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

شب۔ کے۔ مترا
ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ
نئی دہلی

نئی دہلی
ستمبر 1981

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

1

اور لوگوں کی طرح فن کار بھی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور اسی لیے ہمارے لیے فن کار کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ پریم چند ایک بڑے فن کار تھے اور ان کے ذہنی اور فنّی ارتقا کا مطالعہ ان کی زندگی کے حالات کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ بچپن کے حالات پر روشنی ڈالنا خصوصاً ضروری ہوتا ہے کیونکہ ماہرین نفسیات ہمیں بتاتے ہیں کہ بچپن میں جو اثرات ذہن پر مرتب ہوتے ہیں وہ آگے چل کر انسان کے ذہنی ارتقا میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں - دراصل زندگی کا یہ دور بڑا ہی حساس اور کئی معنوں میں فیصلہ کن دور ہوتا ہے۔ اس لیے ہم شروع میں پریم چند کے بچپن کا جائزہ لیں گے۔

پریم چند خود اپنی زندگی کو سادہ اور سپاٹ بتاتے ہیں۔ وہ خود ایک جگہ اپنی زندگی پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> "میری زندگی ایک سادہ اور سپاٹ میدان ہے جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ملیں گے، لیکن اس میں ٹیلے، پہاڑیاں، گھنے جنگل، گہری وادیاں یا کھنڈر نہیں ملیں گے۔ پہاڑوں میں گھومنے پھرنے والوں کو یہاں سخت مایوسی ہوگی۔"

پریم چند کا اپنی زندگی کا جائزہ نہایت سادہ مگر علامتی پہلو اور گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ دیہاتی

www.taemeernews.com

زندگی سادہ اور سپاٹ ہی ہوتی ہے اور قدرے پرسکون بھی۔ شہروں کی طرح نہ گہما گہمی اور نہ رنگا رنگی۔ دیہات کے لوگ صابر و شاکر اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ نئی نئی تمنائیں اور آرزوئیں یہاں جنم ہی نہیں لیتیں۔ بس کسی طرح روکھی سوکھی میسر آجائے اور پھٹے پرانے کپڑے نصیب ہو جائیں۔ زندگی کی یہی پہلی اور آخری تمنا ہر چیز کا محور بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اتنی سادہ سی آرزو پوری کرنے کے لیے بھی ہندوستانی کسانوں کو جو جدوجہد کرنا پڑتی تھی، پریم چند کی کہانیاں اسی کی داستان ہیں۔ ان کے فن کار آ ذہن نے کسانوں کی زندگی کے سطحی سکون کو چیر کر اس کا بھرپور مشاہدہ کر لیا تھا۔

پریم چند کی سادہ اور سپاٹ زندگی نے کس طرح کسانوں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور دیہاتی سماج کی حرکیات (dynamics) کو اپنی گرفت میں لیا اس کا انکشاف پریم چند کے ناقدوں کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ فن کار کے لاشعور کی گہرائیوں میں اُتر کر ہی اس چیلنج کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند خود ہمیں اپنی زندگی کے پیچیدہ موڑوں کا کوئی پتہ نہیں دیتے۔ اپنی زندگی کا خلاصہ وہ چند لفظوں میں یوں پیش کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں :

> "تاریخ پیدائش 1937 سمبت ہے۔ باپ کا نام منشی عجائب لال۔ سکونت موضع مڑھوا لمہی، متصل پانڈے پور، بنارس۔ ابتداً آٹھ سال تک فارسی پڑھی، پھر انگریزی شروع کی۔ بنارس کالجیٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا۔ والد کا انتقال پندرہ سال کی عمر میں ہو گیا۔ والدہ ساتویں سال گذر چکی تھیں۔ پھر تعلیم کے صیغے میں ملازمت کی۔ 1901ء سے لٹریری زندگی شروع کی۔"

ظاہر ہے محض اتنی سی روپ ریکھا ہمارے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اور ذرائع دیکھنا ہیں جن میں ان کی بیوی شیورانی کی کتاب "پریم چند گھر میں" اور ان کے بیٹے امرت رائے کی کتاب "قلم کا سپاہی" ہمارے لیے خاص طور سے مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

www.taemeernews.com

پریم چند کے گاؤں لمہی کا ایک منظر

پریم چند کا جنم 31 جولائی 1880ء کو لمہی نام کے گاؤں میں ہوا جو موضع مڑھوا میں بنارس سے اعظم گڈھ جانے والی سڑک پر بنارس سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں لمہی میں پندرہ بیس گھر کرمیوں کے، دو ایک کمہار، ایک آدھ ٹھاکر، تین چار مسلمان، اور نو دس گھر کائستھوں کے تھے۔ یہی تھی کل آبادی اس گاؤں کی۔ منشی پریم چند کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا۔ پریم چند کا اصلی نام دھن پت رائے تھا۔ دھن پت رائے سے پریم چند بننے کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ جو ہم بعد میں سنائیں گے۔ پریم چند کا جنم ایک

www.taemeernews.com

کچے مگر بڑے سے مکان میں ہوا تھا، یہ مکان ان کے دادا گرسہائے لال پٹواری نے بنوایا تھا۔ پٹواری اگر چالاک ہو تو وہ گاؤں کے راجہ سے کم نہیں ہوتا۔ وہی گاؤں کا کرتا دھرتا بن بیٹھتا ہے اور اپنی آمدنی کے راستے بھی پیدا کر لیتا ہے۔ گرسہائے لال اپنے پیشے کے گُروں سے اچھی طرح واقف تھے۔ جلد ہی انہوں نے ساٹھ پینسٹھ بیگھے زمین بھی خرید لی جو انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے مہادیر لال کے نام لکھ دی۔ امرت رائے ہمیں بتاتے ہیں کہ گُرسہائے لال شراب پینے کے بھی عادی تھے اور دوسرے شرابیوں کی طرح نشے میں اپنی بیوی کی خبر بھی لیا کرتے تھے، اُن کے لڑکوں کو اپنی ماں کے ساتھ یہ بُرا برتاؤ بہت کھلتا مگر کر ہی کیا سکتے تھے۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے۔ البتہ اُن کے بڑے بیٹے مہادیر اسم بامسمیٰ ہٹے کٹے اور بڑے بہادر تھے۔ کبھی کبھی ماں کو پٹتا دیکھ کر باپ پر پِل پڑتے اور انہیں اپنے قابو میں کر لیتے۔ امرت رائے "قلم کا سپاہی" میں لکھتے ہیں:

"آئے دن یہ ناٹک گھر میں ہوا کرتا لیکن مار پیٹ بند نہیں ہوئی اور اسی طرح پٹواری گیری کرتے، ٹھرا پیتے اور بیوی کو دُھنکتے ہوئے منشی گرسہائے لال بچپن ساٹھ کی عمر تک جیے۔"

گرسہائے لال کے چار بیٹے تھے مہادیر لال، کلیشور لال، عجائب لال اور ادتیہ نارائن لال۔ دھن پت رائے عرف منشی پریم چند عجائب لال کے بیٹے تھے۔ عجائب لال ڈاک خانے میں منشی ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کلیشور اور ان کے بعد ادتیہ نارائن نے بھی ڈاک خانے میں منشی گری کا ہی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن کلیشور نے 30 برس کی عمر میں ہی اس دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ کلیشور لال کا بیٹا بھی اپنے باپ کی طرح تقریباً اسی عمر میں اپنی بیوی اور چار بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔ ادھر ادتیہ نارائن پر غبن کا مقدمہ چلا اور سات سال کی قید ہو گئی۔ کہتے ہیں جیل سے رہائی کے بعد گاؤں لوٹنے کی ہمت نہ ہوئی اور منہ چھپا کر کہیں چل دیے اور پھر ان کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ ان کا لڑکا بھی آوارہ ہو گیا۔ تین لڑکیوں میں سے دو لڑکیوں کی

www.taemeernews.com

شادی ہوئی اور ایک نے کنوارپن کو سینے سے لگائے زندگی کے دن کاٹ دیے۔

اب عجائب لال تنہا کمانے والے اور اتنا بڑا کنبہ۔ ڈاک خانے سے بیس پچیس روپے ماہوار سے زیادہ نہ مل پاتا۔ اسی میں سے گھر کا خرچ چلتا اور تینوں بے آسرا عورتوں کی روزی بھی۔ ادتیہ نارائن کی بچی کی شادی کا انتظام بھی اسی آمدنی میں سے ہوا۔ ویسے اوپر کی آمدنی کی کوئی صورت تو نہ تھی مگر گاؤں کے ان پڑھ کرمیوں کی طرف سے ان کے عزیزوں رشتے داروں کو خط لکھتے یا ان کے نام آئے ہوئے خطوط پڑھ دیتے۔ اس کے صلے میں گیہوں، چاول، سبزی اور دودھ مفت مل جاتا۔ عجائب لال آدمی تھے شریف کوئی بُری عادت نہ تھی۔ سارا گاؤں ان کی عزت کرتا تھا۔ پنچ بھی بنائے جاتے تو انصاف کا دامن نہ چھوڑتے۔ گیتا پاٹھ بھی کرتے اور پوری طرح دھرم کا پالن کرتے۔ بیوی بھی نیک مزاج اور سگھڑ تھیں۔ آنندی دیوی سیرت اور صورت دونوں کی اچھی تھیں۔ خدمتِ خلق کا جذبہ ان میں بھی تھا اور اپنے شوہر ہی کی طرح گاؤں میں نیک نام تھیں۔ ان کی پہلے دو لڑکیاں ہوئیں لیکن جلد ہی دونوں خدا کو پیاری ہو گئیں۔ تیسری بار بھی لڑکی ہوئی مگر اس بار زندہ رہی اور سُکی نام پڑ گیا اس کے سات آٹھ برس بعد دھن پت رائے پیدا ہوئے۔ تایا پیار سے "نواب" کہہ کر پکارتے تھے، اسی لیے سب سے پہلے پریم چند نے نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا۔

ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ ماں دونوں کو جی جان سے چاہتی تھیں۔ لیکن نواب کچھ زیادہ ہی چہیتے تھے۔ سب سے چھوٹا اور اُس پر لڑکا۔ ماں کلیجے سے کیوں نہ لگائے رکھتی۔ امرت رائے کہتے ہیں "ماں کو ہر دم یہی ڈر لگا رہتا کہ کوئی اس کے بیٹے کو نظر لگا دے گا، کچھ جادو ٹونا کر دے گا۔ لڑکا چنچل تھا بھی، جسے ٹونا کہتے ہیں۔ ہر دم کیا پھونک کرواتی رہتی، رائی نون سے نظر اُتراتی رہتی۔ اور ڈِٹھونا تو نواب کو پانچ چھ سال کی عمر تک لگایا جاتا رہا۔ ماں کا بس چلتا تو وہ کبھی بیٹے کو اپنے آنچل سے الگ نہ ہونے دیتی۔"

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ماں اپنے لاڈلے کو سات آٹھ برس سے زیادہ اپنی چھتر چھایا میں

www.taemeernews.com

نہ رکھ سکی۔ آنندی دیوی سخت بیمار ہوئیں اور چھ مہینے کے اندر اندر سب کو روتا چھوڑ کر چل بسیں۔ نواب کو ماں کی یاد آتی تو چپکے چپکے آنسو بہاتے۔ اب ان کا بھیا (چچیرے بھائی) کے سوا کوئی ساتھی نہ تھا۔ بھیا ہی اُن کا خیال رکھتے۔ یوں تو عجائب لال کا مختلف دیہاتوں اور قصبوں میں تبادلہ ہوتا رہتا۔ کبھی باندہ، کبھی اعظم گڈھ، کبھی بستی گورکھپور تو کبھی لکھنؤ کے آس پاس۔ کبھی بیوی بچے ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی وہ لمہی میں ہی رہ جاتے۔ لیکن ادھر بیوی کے انتقال کے بعد عجائب لال لمہی چلے آئے اور بیمار رہے۔ دھن پت رائے کے لیے پھر وہی مولوی صاحب اور ان کا مکتب، گلی ڈنڈا اور کھیتوں سے چرائے ہوئے مٹر اور گنے۔

دھن پت رائے بچپن میں بڑے شریر تھے۔ کھیتوں سے مٹر اور گنے توڑنا کوئی ان سے سیکھتا۔ انہیں نت نئی شرارتیں سوجھتیں۔ ہر روز لوگ ان کی ماں کے پاس شکایتیں لے کر آتے۔ کسی کو پیٹ دیتے تو کسی کا کان کاٹ لیتے اور کسی کی حجامت ہی بنا ڈالتے۔ ایک دن اپنے ساتھی رامو کا بانس کی قمچی سے کان زخمی کر دیا۔ رامو کی ماں اپنے بچے کا کان لہو لہان دیکھ کر نواب کی ماں کے پاس کوسنے دیتی ہوئی پہنچی۔ نواب کی ماں نے دو تین تھپڑ لگا کر کان کاٹنے کی وجہ پوچھی تو نواب نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا "پتہ نہیں کیسے کٹ گیا۔ میں تو اُس کی حجامت بنا رہا تھا!" دھن پت رائے اور ان کے چچیرے بھائی ہم جولی تھے۔ ساتھ ساتھ مولوی صاحب کے مکتب جاتے اور راستے میں طرح طرح کی شرارتیں کرتے۔

اس کا ذکر ہمیں پریم چند کی کہانی "چوری" میں ملتا ہے۔ اس کہانی کا انداز دیکھیے:

"ہائے بچپن، تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا ٹوٹا گھر، وہ پوال کا بستر، وہ برہنہ جسم، برہنہ پا کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ کھیتے جوتے پہن کر اس وقت جتنی خوشی ہوتی تھی، اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی۔ گرم پتلے رس میں جو لذت تھی، وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں۔ چبینے اور کچے بیروں میں جو ذائقہ تھا، وہ اب شیر برنج اور کھیر میں بھی نہیں ملتا۔

www.taemeernews.com

میں اپنے چچازاد بھائی بلدھر کے ساتھ دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کی ہوگی۔ بلدھر (وہ اب بہشت میں ہیں) مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ ہم دونوں علی الصبح باسی روٹیاں کھا کر دوپہر کے لیے مٹر اور جو کا چربن لے کر جاتے۔ کوئی حاضری کا رجسٹر تو تھا نہیں، اور نہ غیر حاضری کا جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ پھر خوف کس بات کا! کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گذار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑی کی بہار دیکھتے۔ گاڑیوں کے وقت کا جتنا علم ہم کو تھا، اتنا شاید ٹائم ٹیبل کو بھی نہ تھا۔ راستے میں شہر کے مہاجن نے ایک باغ لگوانا شروع کیا تھا۔ وہاں ایک کنواں کھُد رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے لیے ایک دلچسپ تماشا تھا۔ بڈھا مالی ہمیں اپنی جھونپڑی میں محبت سے بٹھاتا تھا۔ ہم اس سے جھگڑ جھگڑ کر اس کا کام کرتے۔ کہیں بالٹی لیے پودوں کو سینچ رہے ہیں۔ کہیں کھُرپی سے کیارا گوڑ رہے ہیں۔ کہیں مقراض سے بیلوں کی پتیاں چھانٹ رہے ہیں۔ ان کاموں میں کتنا لطف تھا۔ مالی بچوں کی فطرت کا عالم تھا۔ ہم سے کام لیتا، مگر اس طرح کہ گویا ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ جتنا کام وہ دن بھر کرتا، اسے ہم گھنٹہ بھر میں ختم کر دیتے۔

کبھی کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اتر جاتیں۔ اتنی تخیلی قوت آج ہوتی، تو ایسا ناول لکھ مارتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہت سر کھپانے کے بعد کوئی کہانی سوجھتی ہے۔ خیر، ہمارے مولوی صاحب درزی تھے۔ مولوی گیری صرف شوقیہ کرتے تھے۔ ہم دونوں بھائی اپنے گاؤں کے کُرمی کمہاروں سے ان کی خوب تعریف کرتے۔ یا کہیے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے سفری

www.taemeernews.com

ایجنٹ تھے ۔ہماری کوشش سے مولوی صاحب کو جب کچھ کام مل جاتا تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے ۔

جس روز کوئی بہانہ نہ سوجھتا ۔ اس روز مولوی صاحب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے جاتے کبھی سیر آدھ سیر پھلیاں توڑ لیں تو کبھی دس پانچ گنے ، کبھی جو یا گیہوں کی ہری ہری بالیں لے لیں ۔ ان تحفہ جات کو دیکھتے ہی مولوی صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا ۔ جب ان چیزوں کی فصل نہ ہوتی تو ہم سزا سے بچنے کی کوئی اور ہی تدبیر سوچتے ۔"

کیسی معصوم شرارتیں تھیں یہ ۔ بچے بھی اپنے بڑوں کے مزاج سے خوب واقف ہوتے ہیں اور ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا جانتے ہیں اور پھر پریم چند تو فنکارانہ صلاحیتوں کے مالک تھے ان کا زرخیز ذہن نئی نئی باتیں سوچ لیتا اور مولوی صاحب کو جھانسا دینے کی نت نئی تدبیریں سوچتا رہتا ۔ مولوی صاحب کو تو ان شریر بچوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بنتی ۔ ایک معنیٰ میں دیہات کی زندگی ہی کیا ۔ اسی لیے تو پریم چند نے اسے سپاٹ زندگی بتایا ہے ۔ مگر فنکار کا مشاہدہ تو بہت تیز ہوتا ہے ۔ وہ سادگی میں پیچیدگیاں اور یکسانیت میں بھی رنگا رنگی تلاش کر لیتا ہے ۔ آخر سادہ جینے میں بھی سو الجھنیں ہوتی ہیں اور جنہوں نے پریم چند کو پڑھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں کتنی خوب صورتی سے دیہات کی سادہ سی زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں ، محرومیوں اور دکھوں کو پیش کیا ہے ۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ خوشیاں اور محرومیاں اضافی باتیں ہیں ۔ جہاں ایک بڑا سرمایہ دار لاکھوں کی دولت پاکر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا ایک دیہات کا کسان ایک روپیہ پاکر ہو جاتا ہے اور یہی روپیہ اگر گم ہو جائے تو اسے اتنا ہی دکھ ہوتا ہے جتنا ایک لکھ پتی کو اپنی ساری دولت گنوا کر ہوتا ہے ۔ پریم چند ایک حساس فن کار کی حیثیت سے ان باتوں کو خوب سمجھتے تھے ۔ دیکھیے اپنی کہانی "چوری" میں ایک روپیہ پانے کی بچپن میں اپنی خوشی کو کس طرح بیان کیا ہے :

www.taemeernews.com

پریم چند کا آبائی مکان

"برسات کے دن تھے۔ آکاش پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں خوش خوش مکتب چلے جا رہے تھے۔ ہزاروں منصوبے باندھتے تھے، ہزاروں ہوائی قلعے بناتے تھے۔ یہ موقع بڑی خوش قسمتی سے ملا تھا۔ اس لیے روپے کو اس طرح خرچ کرنا چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دنوں تک چل سکے۔ اُن دنوں پانچ آنے سیر بہت اچھی مٹھائی ملتی تھی

www.taemeernews.com

اور شاید آدھے سیر مٹھائی میں ہم دونوں سیر ہو جاتے لیکن یہ خیال آیا کہ مٹھائی کھائیں گے تو روپیہ آج ہی ختم ہو جائے گا۔ کوئی سستی چیز کھانی چاہیے جس میں مزہ بھی آئے، پیٹ بھی بھرے اور پیسے بھی کم خرچ ہوں۔ آخر امرودوں پر ہماری نظر گئی۔ ہم دونوں راضی ہو گئے۔ دو پیسے کے امرود لیے سستا وقت تھا۔ بڑے بڑے بارہ امرود ملے۔ ہم دونوں کے کرتوں کے دامن بھر گئے۔ جب ہلدھر نے کنجڑن کے ہاتھ میں روپیہ رکھا تو اس نے شک کی نظر سے دیکھ کر پوچھا روپیہ کہاں پایا لالا؟ چرا تو نہیں لائے؟ جواب ہمارے پاس تیار تھا۔ زیادہ نہیں تو دو تین کتابیں پڑھ ہی چکے تھے۔ تعلیم کا کچھ کچھ اثر ہو چلا تھا۔ میں نے جھٹ سے کہا۔ مولوی صاحب کی فیس دینی ہے۔ گھر میں پیسے نہ تھے تو چاچا جی نے روپیہ دے دیا۔"

اس قصے میں جہاں بچپن کا مشاہدہ، چلبلاپن اور ذہنی اُپج پائی جاتی ہے وہاں ہمارے طرزِ تعلیم پر ہلکا سا طنز بھی ہے۔ "تعلیم کا کچھ کچھ اثر ہو چلا تھا" اس جملے میں یہ طنز جھلکتا ہے کہ تعلیم ہمیں اچھا انسان بنانے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کی حفاظت کے لیے چالاک اور ہوشیار بناتی ہے۔ ان دونوں بچوں نے بھی اسی تعلیم کے زیرِ اثر اپنے بچاؤ کے لیے فوراً بہانہ تراش لیا۔

اپنی ماں کی موت کے بعد پریم چند کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد عجائب لال نے دوسری شادی کر لی۔ دھن پت رائے کی سوتیلی ماں کا برتاؤ اُن کے ساتھ بہت اچھا نہ تھا۔ پٹائی بھی ہوتی۔ عجائب لال بھی اپنے آپ کو بے بس پاتے۔ بڑھاپے کی شادی تھی۔ جوان بیوی اپنے بوڑھے خاوند کی ڈانٹ ڈپٹ کہاں سننے والی تھی۔ اس کی ساس سے بھی نہ بنتی۔ لیکن ساس کا تو چند دنوں بعد انتقال ہو گیا۔ دھن پت رائے اپنی سوتیلی ماں کو چاچی کہہ کر پکارتے۔ چاچی اپنے ساتھ اپنا چھوٹا بھائی وجے بہادر بھی لائی تھی۔ یہ عمر میں دھن پت رائے سے بڑے تھے مگر دونوں میں خوب پٹتی۔

www.taemeernews.com

چاچی جی اب سارے گھر کی تنہا مالک تھیں ۔ دھن پت رائے ڈر کے مارے اکثر گھر سے غائب رہتے۔ ان کو رہنے کے لیے جو کوٹھری ملی تھی اس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اس لیے آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہ تھی ۔ قریب میں ہی ان کے ایک ہم جماعت کے والد کا تمباکو کا کاروبار تھا۔ وہیں جاکر بیٹھ جاتے اور طلسم ہوش ربا کی داستان پڑھی جاتی جو ان کے تخیل کے لیے بھی مہمیز ثابت ہوئی ۔ یہ آوارہ گردی کے دن تھے ۔ امرت رائے نے "قلم کا سپاہی " میں اسے یوں بیان کیا ہے :

"بارہ تیرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اُسے (پریم چند کو) سگریٹ بیڑی کا چسکا لگ چکا تھا۔ اور اپنے ہی لفظوں میں اُن باتوں کا علم ہو چکا تھا جو بچوں کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ بنا ماں کے بچے کا ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ نہ ہو تو تعجب کی بات ہے .... وہ پیار چھن جائے، سر پہ سے وہ ہاتھ ہٹ جائے تو ایک ایسی کمی محسوس ہوتی ہے جو بچے کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بہت سے سانچے ، بہت سی مورتیاں ٹوٹ جاتی ہیں جن کو بنانے میں برسوں لگے تھے۔"

پریم چند کے لیے یہ واقعہ بڑا ہی جانکاہ تھا۔ عمر بھر وہ اس غم کو بھول نہیں سکے ۔ اس کا اظہار ان کے تخلیق کردہ کرداروں میں نت نئے طریقوں سے ہوتا رہا ۔ ان کے ایک ناول " میدانِ عمل" میں ایک کردار امرکانت کہتا ہے :

"زندگی کی وہ عمر جب انسان کو محبت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے ، بچپن ہے۔ اس وقت پودے کو تری مل جائے تو زندگی بھر کے لیے اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اُس وقت خوراک نہ پاکر اس کی زندگی خشک ہو جاتی ہے۔ میری ماں کا اُسی زمانے میں انتقال ہوا اور تب سے میری روح کو خوراک نہیں ملی۔ وہی بھوک میری زندگی ہے۔"

www.taemeernews.com

کتنا درد اور کتنی تڑپ ہے ان سیدھے سادے لفظوں میں۔ ایسا لگتا ہے مصنف نے اپنے دل کا درد بھر دیا ہے، اپنی روح کا غم سمو دیا ہے۔ تخلیقی عمل میں بچپن کے گہرے تاثرات بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اس عمل کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں فرائڈ اور یونگ کے نفسیات کے نظریوں کو اہمیت حاصل ہوئی اور سُرریلزم کی تحریک نے ادبی نظریات کو ایک نیا موڑ دیا۔ ادیب کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لیے اس کے سماجی اور گھریلو حالات کا مطالعہ اسی لیے بڑا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پریم چند نے میدانِ عمل میں اپنے بچپن کے تجربے کو بعض جگہ تو براہِ راست بیان کر دیا ہے۔ امرکانت کی کہانی اُن کی اپنی کہانی بن جاتی ہے۔

"امرکانت نے اپنے دوستوں کے کہنے سننے سے دوسری شادی کر لی تھی۔ اُس سات سال کے بچے نے نئی ماں کا بڑے پیار سے استقبال کیا، لیکن اُسے جلد معلوم ہو گیا کہ اُس کی نئی ماں اُس کی ضد اور شرارتوں کو معاف کر دینے والی نظروں سے نہیں دیکھتی جیسے اُس کی ماں دیکھتی تھی۔ وہ اپنی ماں کا اکیلا لاڈلا تھا۔ بڑا ضدی، بڑا نٹ کھٹ۔ جو بات منھ سے نکل جاتی، اُسے پورا کر کے ہی چھوڑتا۔ نئی ماں بات بات پر ڈانٹتی تھی۔ یہاں تک کہ اُسے ماں سے بُغض ہو گیا جس بات کو وہ منع کرتی، اسے زیادہ جوش سے کرتا۔ باپ سے بھی کدورت ہو گئی۔ باپ اور بیٹے میں خوشی کا رشتہ نہ رہا۔"

جیسا کہ اوپر بتایا گیا پریم چند اپنی تنہائی کی اذیت سے بچنے کے لیے طلسم ہوش ربا کی داستانوں میں پناہ لیتے تھے۔ ان داستانوں نے لکھنے کی صلاحیت کو ابھارا۔ ان کے لکھنے کی ابتدا کیوں کر ہوئی اس کی کہانی ان ہی کی زبانی سنیے:

"اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال رہی ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا شوقین تھا۔ مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی

www.taemeernews.com

ہر دوئ دلے اس وقت کے ہر دلعزیز ناول نگار تھے، ان کی کتابیں جہاں کہیں مل جاتی تھیں اسکول کی یاد بھول جاتی تھی اور کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانے میں رینالڈ کے ناولوں کی بھی دھوم تھی۔ اردو میں ان کے ترجمے دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔"

"اسی زمانے میں میرے ایک رشتے کے ماموں کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے۔ ادھیڑ ہو گئے تھے اور ابھی تک کنوارے تھے..... رشتے داریوں میں گھومتے تھے، اور سب سے یہی امید رکھتے تھے کہ کوئی ان کا بیاہ کرا دے۔ اس کے لیے سو دو سو خرچ کرنے کو بھی تیار تھے۔ ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی، تعجب ہے۔ اچھے خاصے بنٹے کٹے آدمی تھے، بڑی بڑی مونچھیں، اوسط قد، سانولا رنگ..... آخر ایک بار انہوں نے وہی کیا جو بن بیاہے لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ ایک چمارن کی ترچھی نظر کے گھائل ہو گئے۔ وہ اُن کے ہاں گوبر تھاپنے بیلوں کو سانی پانی دینے کے لیے اور اسی طرح کے دوسرے چھٹ پٹ کاموں کے لیے نوکر تھی۔ جوان تھی چھبیلی تھی، ماموں صاحب کا پیاسا دل میٹھے پانی کی دھار دیکھتے ہی پھسل پڑا۔ باتوں باتوں میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ ان کے من کا بھاؤ تاڑ گئی، ایسی الھڑ نہ تھی، اور نخرے کرنے لگی۔ بالوں میں تیل بھی پڑنے لگا، چاہے سرسوں کا ہی کیوں نہ ہو، آنکھوں میں کاجل بھی چمکا، ہونٹوں پر مسّی بھی آئی اور کام میں ڈھیل بھی شروع ہو گئی..... یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ وہ چمارن ہی گھر کی مالکن ہو گئی۔"

"ایک دن شام کے وقت چماروں نے آپس میں پنچایت کی۔ بڑے آدمی ہیں تو ہوا کریں، کیا کسی کی عزت لیں گے..... اس لیے فیصلہ ہوا کہ لالہ صاحب کو ایسا سبق دینا چاہیے

www.taemeernews.com

کہ ہمیشہ کے لیے یاد رہے۔ عزت کا بدلا خون سے ہی چکتا ہے، لیکن مرمت سے بھی اس کی کمی پوری ہو ہی سکتی ہے۔ دوسرے دن شام کو جب چمپا ماموں صاحب کے گھر آئی تو انہوں نے اندر کا دروازہ بند کرالیا.... اُدھر چماروں کا جتھا تاک میں تھا ہی، ادھر کواڑ بند ہوئے اُدھر انہوں نے دروازا کھٹکھٹانا شروع کیا.... کواڑ توڑے گئے ماموں صاحب بھوسے کی کوٹھری میں چھپے ہوئے ملے .... ماموں صاحب بھاگ کر کہاں جاتے .... مار پڑنے لگی اور بے بھاؤ کی پڑی .... یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے۔ اس واردات کی خبر اُڑتے اُڑتے ہمارے یہاں بھی پہنچی، میں نے اس کا خوب مزا لیا.... اگر انہوں نے کچھ عاجزی ظاہر کی ہوتی تو مجھے شاید ان سے ہمدردی ہو جاتی، لیکن ان کے وہی دم خم تھے، مجھے کھیلتے یا ناول پڑھتے دیکھ کر بگڑنا یا رعب جمانا اور پتاجی سے شکایت کی دھمکی دینا۔ یہ اب میں کیوں سہنے لگا تھا۔"

"آخر میں نے یہ ساری واردات ایک ناٹک کی شکل میں لکھ ڈالی اور اپنے دوستوں کو سنائی۔ سب کے سب خوب ہنسے۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے اسے صاف کر کے کاپی ماموں صاحب کے سرہانے رکھ دی اور اسکول چلا گیا۔"

ماموں صاحب نے ظاہر ہے اُن کی یہ تصنیف ضائع کر دی اس لیے ان کے لکھے ہوئے پہلے ڈرامے کے متعلق ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ 13 سال کے اس لڑکے میں لکھنے کی طرف رغبت پیدا ہو چکی تھی اور ہمیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بچے بڑوں کے بیجا رعب جمانے کا بدلہ کس طرح لیا کرتے ہیں۔

پریم چند کو گلی ڈنڈا کھیلنے میں بھی خوب مزا آتا اور رام لیلا کے کھیل میں بھی۔ انہیں کتنا مزا آتا تھا انہی کی زبانی سنیے۔ دیکھیے کیسے مزے لے لے کر سناتے ہیں۔" ادھر ایک عرصے سے رام لیلا دیکھنے نہیں

www.taemeernews.com

گیا تھا۔ بندروں کے بھدّے چہرے لگائے، آدھی ٹانگوں کا پاجامہ اور کالے رنگ کا اونچا کرتا پہنے آدمیوں کو دوڑتے، ہو ہو کرتے دیکھ کر اب ہنسی آتی ہے.... لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے بھی رام لیلا میں مزہ آتا تھا۔ مزہ تو بڑا ہلکا لفظ ہے اُسے جوش کہنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے میرے گھر سے بہت نزدیک ہی رام لیلا کا میدان تھا۔ اور جس گھر میں لیلا پاتروں کا روپ رنگ بھرا جاتا تھا، وہ تو میرے گھر سے بالکل ملا ہوا تھا۔ دو بجے دن سے پاتروں کی سجاوٹ ہونے لگتی تھی.... رنگ کی پیالیوں میں پانی لانا، رام راج پیسنا، پنکھا جھلنا میرا کام تھا۔

پریم چند کو رام لیلا کے ہیرو رام چندر جی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ انہیں سچ مچ رام چندر ہی سمجھ کر عزت کرتے۔ کہتے ہیں: "لیکن میری عقیدت ابھی تک جوں کی توں تھی۔ میری نظر میں وہ اب بھی رام چندر ہی تھے۔ گھر پر مجھے کھانے کی کوئی چیز ملتی، وہ لے کر رام چندر کو دے آتا۔ انہیں کھلانے سے مجھے جو خوشی ہوتی تھی اتنی آپ کھا جانے میں کبھی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی مٹھائی یا پھل پاتے ہی بے تحاشا چوپال کی اور دوڑتا۔" وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ "وِمان (سواری) نکلتا تو اس پر رام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر مجھے فخر و مسرت کا جو احساس ہوتا وہ اب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی پر بیٹھ کر بھی نہیں ہوتا۔"

www.taemeernews.com

2

اسی طرح کھلنڈرے پن میں بچپن بیتتا گیا اور یہ سارے واقعات ہمارے مصنف کے دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑ گئے۔ آگے چل کر یہی واقعات ان کی کئی کہانیوں اور ناولوں کے لیے کچا مواد ثابت ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں دھن پت رائے نویں جماعت میں پہنچ چکے تھے۔ پڑھائی ان کے لیے کھیلوں کی سیج نہیں تھی۔ اپنے گاؤں سے بنارس روزانہ جانا پڑتا۔ باپ سے صرف پانچ روپے مہینے کے ملتے۔ ان دنوں خود اپنی حالت منشی جی نے یوں بیان کی ہے:

"پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے، مہنگائی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کاشی کے کوینس کالج میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ چار بجے پہنچتا تھا۔ پڑھا کر چھ بجے چھٹی پاتا۔ وہاں سے میرا گھر دیہات میں پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے سے پہلے گھر نہ پہنچ سکتا۔ اور صبح آٹھ ہی بجے پھر گھر سے چلنا پڑتا تھا، وقت پر اسکول نہ پہنچ پاتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ جانے کب سو جاتا۔

www.taemeernews.com

پھر بھی ہمت باندھے ہوئے تھا"۔

تھے نا کتنے کٹھن دن! اور اس پر ماں، باپ شادی کرانے کی فکر میں تھے۔ نویں جماعت کے سالانہ امتحان سے کچھ دن پہلے عجائب لال نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ویسے بھی پورب میں جلدی بیاہ رچانے کا چلن ہے۔ دھن پت رائے بھی خوش تھے۔ منڈپ کے بانس خود ہی کاٹے۔ یہ شادی عجائب لال کے نئے سسر یعنی دھن پت رائے کے سوتیلے نانا نے طے کی تھی۔ بستی شہر سے دس میل دور رمواپور سرکاری گاؤں کے ایک چھوٹے موٹے زمیندار کی بیٹی سے رشتہ طے ہوا تھا۔ دلہن کو دیکھنے کا چلن تو تھا نہیں۔ بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ اچھی ہی ہوگی۔ دھن پت رائے نے بھی اپنے تخیل میں رنگ بھرے۔ تھے کہانیوں کی شہزادی تصور میں ناچ رہی تھی۔ کوئی مہ جبیں ہوگی۔ سپنوں کی شہزادی۔ شادی ہوئی۔ دلہن کو اونٹ گاڑی پر سوار اپنے گھر لائے۔ دلہن کا گھونگھٹ کیا اُٹھا، دنیا اُلٹ گئی۔ دلہن عمر میں نہ صرف بڑی تھی، کالی بھی تھی۔ صورت بھی اچھی نہ تھی لیکن یہاں تو سیرت نے بھی دھوکا دیا۔ حقیقت نے دل ہلا دینے والا جھٹکا دیا تھا۔

زبان بھی دلہن نے کڑوی کسیلی پائی تھی۔ ساس سے نبھا نہ سکی۔ چاچی بات بات میں بہو کی شکایتیں کرتی۔ دھن پت رائے کی جان عذاب میں تھی۔ گھر میں یہ جھک جھک اور سارا دن اسکول اور ٹیوشن کی محنت۔ اِدھر چند ہی دنوں میں پرانے پتھری کے مرض سے عجائب لال ایسے بستر سے لگے کہ اُٹھ نہ سکے۔ آمدنی کی ایک پیسے کی نہیں اور جو کچھ پونجی تھی بیماری پر خرچ ہوگئی۔ مرتے مرتے وہ اپنے جوان بیٹے کے سر، جس کے پاؤں میں جوتے اور بدن پر ثابت کپڑے بھی نہ تھے اپنی جوان بیوی اور دو بچوں کا بار بھی ڈال گئے۔

نتیجہ یہ کہ 1897ء میں اُنہیں میٹرک کا امتحان دینا تھا نہ دے سکے۔ اگلے سال بیٹھے تو دوسرے درجے میں پاس ہوئے اور کوینس کالج میں داخلہ لینا مشکل ہوگیا۔ ویسے بھی فیس معاف

www.taemeernews.com

کرانے کے لیے اوّل درجے میں پاس ہونا ضروری تھا۔ اُسی سال ہندو کالج کھُلا۔ داخلے کا تو یہاں انتظام ہوگیا لیکن سوال فیس کا تھا۔ سفارش بھی ممکن نہ تھی۔ اتنے بڑے شہر میں ایک دیہاتی لڑکے کو کون جانتا تھا۔ کہتے ہیں: "روز گھر سے چلتا کہ کہیں سے سفارش لاؤں پر بارہ میل کی منزل پار کر شام کو گھر لوٹ آتا۔ کس سے کہوں کوئی اپنا پوچھنے والا نہ تھا۔" اور نواب کو جب اندر نارائن، کالج کے انتظامیہ کمیٹی کے ایک رُکن کی سفارش ملی بھی تو قابلیت کے امتحان میں حساب نے بے وفائی کی۔ حساب کے خانے میں غیر اطمینان بخش لکھا کر فیس معاف کرانے سے تو رہے۔ منشی جی آگے کہتے ہیں "میں اتنا حواس باختہ تھا کہ پھر پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا گیا۔ حساب میرے لیے گوری شنکر کی چوٹی تھی۔ کبھی اس پر نہ چڑھ سکا۔"

لیکن اس کے باوجود دھن پت رائے زندگی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی دھن سوار تھی۔ حساب کے مضمون پر زور لگانے کی ٹھان لی تاکہ کالج میں داخلہ لے سکیں۔ اس کے لیے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ انہی دنوں خوش قسمتی سے ایک وکیل صاحب کے لڑکے کو پڑھانے کا کام مِل گیا۔ پانچ روپے مہینہ اُجرت طے پائی۔ اس میں سے تین روپے گھر والوں کی نذر کرتے اور دو روپے خود رکھتے۔ وکیل صاحب نے اپنے اصطبل کے اوپر کچی کوٹھری رہنے کے لیے عنایت کردی، اس میں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھایا، بازار سے ایک پُرانا لیمپ آیا اور شہر میں اسی شان سے زندگی کٹنے لگی۔ اس دور کا خاکہ خود پریم چند نے یوں کھینچا ہے "گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا، ناول وغیرہ پڑھا کرتا، پنڈت رتن ناتھ کا "فسانۂ آزاد"، انہی دنوں پڑھا۔ چندر کانتا سنتی بھی پڑھی۔ بنکم بابو کے ترجمے جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔"

اِدھر پڑھنے کا شوق اُدھر جیون کی کٹھنائیاں۔ اُدھار لیے بغیر نہ بنتی اور اُدھار لے کر ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کا کپڑا ادھار لیا تو تین سال تک چکائے نہ بنی۔ زندگی کی محدود میاں اتنی تھیں کہ مہینے کے آخر میں کچھ روپے (یعنی ڈھائی یا تین) ہاتھ آتے تو من حلوائی

www.taemeernews.com

کی دکان کی طرف کھینچتا اور کچھ آنے خرچ ہو ہی جاتے ۔ آخر پورا مہینہ کھچڑی پر گذر ہوتی تھی ۔ خواہشوں کو مارنے کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے ۔ چکرورتی حساب کی کتاب جو اُن کو اپنے مستقبل کی کنجی نظر آتی تھی (کالج کا داخلہ جو اُس پر منحصر تھا) اور جسے دو سال تک سینے سے لگائے رکھا آخر ادنے پونے بیچنے کی نوبت آہی گئی ۔ بھلا پیٹ کے دوزخ کے مقابلے میں کون جیتا ہے ۔

زندگی ایک مسلسل کوشش ہے لیکن ہمارے ارادوں کے باوجود یہ کوشش ہمیں سیدھی دِشا میں نہیں لے جاتی ۔ کئی رُکاوٹیں ہماری دشا کو بدل دیتی ہیں ۔ لیکن انسان ان حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی دشائیں بدل بدل کر ہی، منزل کی طرف بڑھنے کی دھن میں لگا رہتا ہے ۔ بعض وقت کچھ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہم غیر متوقع طور پر اپنے آپ کو منزل سے قریب پاتے ہیں ۔ ان حالات کا نام آپ کچھ بھی رکھ دیں ، اللہ کی مہربانی ، غیبی امداد ، قسمت کا کھیل ، زندگی کا مُجوا یا اپنی ہی انتھک کوششوں کا نتیجہ! کچھ ایسی ہی غیر متوقع بات ہمارے دھن پت رائے کے ساتھ بھی پیش آئی ۔ انہی کی زبانی سُنیے :

"تقدیر کا کھیل بھی عجیب انوکھا ہے ۔ کہاں تو کیسے کیسے پاپڑ بیل رہے تھے ۔ اگلے وقت کی روٹی کا ٹھکانہ نہیں تھا ، اور کہاں اب پروسی ہوئی تھالی سامنے رکھی تھی "
سوال پوچھنے والے حضرت چنار کے ایک چھوٹے سے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ۔ انہیں میٹرک پاس ایک ماسٹر کی تلاش تھی ۔ تنخواہ تھی اٹھارہ روپے ، کہنے بھر کی دیر تھی ۔
"اٹھارہ روپے اُس سمے میرے مایوس تخیل کی اونچی سے اونچی اڑان سے بھی اوپر تھے "

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ۔ اگلے ہی دن پریم چند نے اُس اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے نوکری کی بات پکی کر لی ۔ یہ واقعہ 1899ء کا ہے ۔ تین چار دن کے اندر ہی وہ چنار پہنچ گئے ۔ اُن کے سوتیلے ماموں وجے بہادر بھی ساتھ تھے ۔ جب تک وجے زندہ رہے دھن پت رائے کا ساتھ نہیں چھوڑا ۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہی اس سنگت کو توڑا ۔ اٹھارہ روپے جو اُس وقت اُن کی تخیل کی اونچی سے اونچی

www.taemeernews.com

اُڑان سے بھی اوپر تھے ، بہت جلد زندگی کی ضرورتوں نے انہیں ناکافی ثابت کر دیا۔ پھر ٹیوشن کی تلاش ہوئی جس سے پانچ روپے اور ملنے لگے۔ دھن پت رائے کو زندگی کی اس جدوجہد سے اتنا وقت بھی نہ ملتا کہ گھر کا انتظام سنبھالیں۔ یہ فرض وجے بہادر جب تک زندہ رہے نبھاتے رہے۔ تنگ دستی کا اب بھی یہ عالم تھا کہ جاڑوں کی چھٹیوں کے بعد لمہی سے ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ آخر اپنا گرم کوٹ بیچنے کی نوبت آئی۔ ایک سال پہلے ہی یہ کوٹ بڑی مشکل سے بنا پائے تھے۔

ایک طرف زندہ رہنے کی جدوجہد اور دوسری طرف دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دلانے کی لڑائی۔ پریم چند دوسروں کے ساتھ ہو رہی ناانصافی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی اسکول میں ابنِ علی نام کے ایک مولوی تھے۔ اسکول کے اعلیٰ عہدیداران کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔ یہ بات پریم چند کو سخت ناپسند تھی۔ اپنی نوکری داؤ پر لگا کر ابنِ علی کے لیے لڑے۔ نتیجے میں خود بھی اسکول سے نکالے گئے اور ابنِ علی بھی۔ اُن سخت حالات میں پریم چند کے لیے یہ بڑی قربانی تھی۔ انصاف کے لیے لڑنے کا یہی جذبہ ان کو آزادیٔ وطن کی جنگ میں بھی پورے جوش و خروش سے شریک کراتا ہے۔ اور انہیں محنت کش کسانوں کی لڑائی لڑنے والوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

بڑی تلاش اور سفارش کے بعد 1900ء میں دھن پت رائے کو ضلع بہرائچ میں پانچویں جماعت کے لیے ماسٹر کے عہدے پر بیس روپے ماہوار کی نوکری ملی۔ یہیں سے ان کی سرکاری نوکری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ دنوں بعد بہرائچ سے تبادلہ ہو کر فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کے طور پر پرتاپ گڈھ آ گئے۔ گاؤں کے ٹھاکر کے مکان میں ہی ایک کمرہ جو اُن کے بچوں کو پڑھانے کے عوض ملا تھا، رہنے لگے۔ یہاں کچھ زیادہ لوگوں سے راہ و رسم نہ تھی۔ اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول۔ زندگی میں اب قدرے اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اس فرصت کو غنیمت جان کر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جتنا پڑھتے اس سے زیادہ لکھتے۔

www.taemeernews.com

3

منشی پریم چند کی زندگی کا یہاں سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ قصے کہانیاں اور طلسمی داستانیں تو انہوں نے بہت پڑھی تھیں۔ تھیں تو یہ من کو لبھانے والی لیکن منشی جی کو یہ شعور ہو چلا تھا کہ آج سماج کو لبھانے اور سلانے والی داستانوں کی نہیں جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے والے ادب کی ضرورت ہے۔ وہ کھلے دل و دماغ سے اپنے آس پاس کے سماج کا جائزہ لے رہے تھے۔ سماج بے انصافیوں کی وجہ سے کراہ رہا تھا۔ عورتوں کے ساتھ ہر طرح کا بُرا برتاؤ جائز سمجھا جاتا تھا۔ نابالغ لڑکی کی بوڑھے سے شادی کر دینا، ودھوا کو جبراً دوسری شادی سے روکنا، جہیز کے ذریعے عورتوں کا سودا کرنا، ذات پات اور اونچ نیچ کی لعنت، انسان کا اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو اچھوت سمجھنا۔ ان مسائل نے دھن پت رائے کو فکر کی دعوت دی اور سماج سدھار کا جذبہ پیدا کیا۔

ان دنوں آریہ سماج کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ سماج کے پرچارک گاؤں گاؤں گھوم کر روایتی قدروں کو للکار رہے تھے۔ جگہ جگہ سبھائیں ہوتیں، بال وِواہ پر تنقید کی جاتی اور ودھوا وواہ کے شاستروں سے ثبوت مہیا کیے جاتے۔ منشی جی کے سینے میں سدھار کا جذبہ موجزن تھا ہی، وہ آریہ سماج کی تحریک کی طرف کھنچنے لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود ان برائیوں کو اپنی زندگی میں بھگت

www.taemeernews.com

چکے تھے ۔ خود اُن کے والد عجائب لال نے بڑھاپے میں جوان عورت سے دوسری شادی کی ۔ خود تو چل بسے لیکن جوان بیوی اور دو بچوں کی ذمہ داری ان کے سر منڈھ گئے ۔ ان کی ساری ذمہ داریاں ان کو نبھانی پڑیں ۔ پھر خود ان کی شادی بچپن میں کردی گئی ایک ایسی لڑکی سے جس کا منھ بھی انہوں نے دیکھا نہ تھا ۔ بالکل بے جوڑ شادی تھی اور یہ ذمہ داری بھی آخر انہیں ہی نبھانا پڑ رہی تھی ۔ چنانچہ امرت رائے لکھتے ہیں:

"وہ (پریم چند) تو خود ایک زندہ مثال تھا ہندو سماج کی جہالت کا ۔ لہٰذا آریہ سماج میں اُس کی دلچسپی پوری تھی ۔ جلسوں میں تو خیر جاتے ہی تھے ، شاید وہ آریہ سماج کے باضابطہ رکن بھی تھے ۔ پرتاپ گڈھ کا حال تو پکا نہیں معلوم لیکن اس کے کچھ ہی سال بعد ہمیر پور میں وہ آریہ سماج کے باقاعدہ ممبر تھے ۔"

انہی دنوں سماج سدھار کے جذبے سے متاثر ہو کر منشی جی نے ایک ناول لکھنا شروع کیا جو بنارس کے ایک ہفتہ وار "آوازِ خلق" میں اکتوبر 1903ء سے فروری 1905ء تک برابر قسطوں میں چھپتا رہا ۔ اس ناول کا عنوان تھا "اسرارِ معابد" ۔ اس پر مصنف کا نام دھن پت رائے عرف نواب رائے الٰہ آبادی دیا گیا ہے ۔ اسرار معابد سرشار کے طرز پر لکھا ہوا ایسا ناول ہے جس میں پنڈوں اور مذہبی ڈھکوسلوں کا مذاق اڑایا گیا ہے ۔ اس ناول میں پریم چند نے مندر کے پجاریوں کی حقیقی زندگی کو بے نقاب کیا ہے ۔ عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی بسر کرنے والے یہی مہنت اور پجاری غریب عقیدت مندوں کو مذہب کے نام پر دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں ۔ مہادیو لنگیشور ناتھ جی کے مندر کے مہنت ترلوکی ناتھ کو پریم چند نے اس طرح پیش کیا ہے :

" اس وقت شری مان بابا ترلوکی ناتھ ماتھے پر لال چندن کا ٹیکا لگائے ، پیلے ریشم کی بھڑکیلی مرزئی ڈاٹے بیٹھے ہیں ۔ گلے میں انمول موتیوں کی ایک موہن مالا پڑی ہوئی ہے ۔ سر پر ایک جڑاؤ ٹوپی عجیب شان سے رکھی ہوئی ہے ۔ اُن کے خونی دانتوں نے بیچارے بے گناہ پان کے بیڑوں کا خون اتنا زیادہ ہے کہ خون کی لالی قاتلوں کے گلے کا ہار

www.taemeernews.com

ہوکر بار بار اُن کی طرف انگلی دکھا رہی ہے اور چونکہ یہ جلّادی دانت خون کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اُنہیں کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگے چین نہیں ....آپ مہنت جی کے ماتھے پر لال نشان دیکھ رہے ہیں، یہ چندن کے نشان نہیں، بلکہ اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ حضرت نے انصاف اور مذہب کا خون کر ڈالا ہے۔ آپ جوان کے گلے میں موہن مالا دیکھ رہے ہیں، یہ اصل میں لوبھ کا پھندا ہے جو آپ کو خوب کس کر جکڑے ہوئے ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ ناول آریہ سماج کے اصلاحی جذبے کے تحت لکھا گیا ہے۔ ناول پر یہی اصلاحی جذبہ غالب ہے اور فنی اعتبار سے یہی ناول کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ بالکل ڈھیلا ڈھالا اور کردار اپنے خالق کے ہاتھ میں کھلونے۔ لیکن یہاں بحث ناول کی فنی خوبیوں یا کمزوریوں سے نہیں ہے۔ فنی اعتبار سے ابھی اُنہیں کئی منزلیں طے کرنا تھیں تاکہ گئودان جیسا اپنا شاہکار تخلیق کر سکیں۔ یہاں سوال اُن کے سماجی شعور، اصلاحی جذبات اور ابھرنے والی نئی سماجی حقیقتوں کے تصور کا ہے۔ اپنی عمر کے اس دور میں ہی پریم چند نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ مذہب منظم ہو کر اگر ایک ادارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو انسانیت کے لیے لعنت بھی بن سکتا ہے۔

اپنے فنی کردار کے ابتدائی دور میں ہی پریم چند نے سماجی حقیقت کے جن پہلوؤں پر توجہ کی وہ یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے انگریزوں کا غلام تھا اور اس احساس غلامی نے ہندوستان کے اوپری طبقے کے دانشوروں کو نفسیاتی اعتبار سے احساسِ کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اوپری طبقے کے یہ دانشور اس احساس کو اپنے ماضی کی شاندار روایتوں اور تہذیبی برتری پر فخر کر کے ظاہر کیا کرتے تھے۔ حقیقت بڑی پیچیدہ ہوتی ہے اور اس کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ فن کار حقیقت کے کن پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے، اس کی کن سطحوں کو چھوتا ہے یہ اس کے سماجی اور طبقاتی شعور پر

www.taemeernews.com

منحصر ہوتا ہے۔ ٹیگور اور اقبال کے یہاں مذہب ایک مجرّد روحانی تصوّر بن کر اُبھرتا ہے، ان کے یہاں معرفت اور وجدان پر زور ہے۔ روحانی اقدار اور تہذیبی کمالات پر سر دھننے کا انداز ہے۔ پریم چند کا سماجی شعور مذہب کے ایک دوسرے پہلو کو پیش کرتا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف مذہب غریب عوام کے لیے ان سے اوپر سماجی مرتبہ رکھنے والوں کے ساتھ استحصال کا بندھن ہے تو دوسری طرف جبر کی چکّی میں پستے ہوئے محنت کش عوام کے لیے اس بے رحم دنیا میں جینے کا آسرا بھی ہے۔ پریم چند سماج کے ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کے لیے مذہب توہمات اور بے جان رسموں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سماج کے کچلے ہوئے ان طبقوں کے لیے وجدان اور روحانیت اجنبی دنیا کی باتیں ہیں۔ پریم چند کے حقیقت نگار قلم نے شروع سے ہی مذہب کی اُس حقیقت کو اُجاگر کیا جسے وہ اپنی دنیا میں محسوس کر رہے تھے۔ اس معنیٰ میں اقبال اور ٹیگور کی دنیا پریم چند کی دنیا سے بالکل مختلف تھی اور مذہب کی طرف ان کے رویّے میں تضاد دراصل ان کی سماجی حیثیت کا تضاد تھا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ان کی شاہکار کہانی "کفن" میں مذہب کی طرف ان کا یہ رویّہ بہت ہی نکھر کر سامنے آیا ہے۔

کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ دھن پت رائے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھتے تھے ان کے اکثر مضامین دیانارائن نگم کی ادارت میں کانپور سے شائع ہونے والے رسالے "زمانہ" میں چھپا کرتے تھے۔ زمانہ میں لکھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اُس میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے۔ اس میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، تنقیدی مضامین اور کتابوں پر ریویو بھی چھپتے تھے۔ "زمانہ" میں دھن پت رائے کا پہلا مضمون حکیم برہم کے ناول "کرشن کنور" کی تنقید کی صورت میں فروری 1905ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ دراصل دھن پت رائے کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز کانپور سے ہی ہوا۔ "زمانہ" میں ہی ان کے دوسرے ناول "ہم خرما و ہم ثواب" کا بھی اشتہار شائع ہوا۔ اس کا اشتہار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دھن پت رائے کی ادبی حیثیت مسلّم ہوتی جا رہی تھی۔ اشتہار میں لکھا گیا تھا:

www.taemeernews.com

"بہرکیف یہ ناول" ہم خرما وہم ثواب "، مسٹر موصوف کی تازہ اور اچھوتی تصنیف ہے. جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔ قصے کی دلچسپی کے ساتھ مصنف کی جادو نگاریاں بڑی تعریف کی مستحق ہیں، اس پائے کے ناول اُردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں"۔

"زمانہ" میں پریم چند کے کچھ سیاسی نوعیت کے مضامین بھی چھپے ۔ اگست 1905ء میں ملکہ وکٹوریہ پر مضمون چھپا، اکتوبر میں راجہ مان سنگھ پر اور نومبر، دسمبر میں گوپال کرشن گوکھلے پر۔ اس کے علاوہ انہوں نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے جن سے دن بہ دن ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دیانرائن نگم سے بھی ان کے تعلقات گہرے ہوتے گئے اور رسالے کی ادارت کی ذمے داری بھی وہ ان کے ساتھ بانٹنے کے لیے راضی ہوگئے ۔ 1906ء میں نگم صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نوبت رائے نہ آئیں۔ کیا جہاں مرغانہ ہوگا وہاں صبح نہ ہوگی ۔ ایڈیٹوریل میں سب کروں گا، خط وکتابت جو معاملے کی ہے وہ میں کروں گا ۔ خاص ایڈیٹر کے توجہ کے قابل جو خطوط ہوں گے وہ خدمت شریف میں پیش ہوں گے ۔ اور کام کرنے کا بندوبست ہونا ضروری ہے .... وقت آئے گا تو مشورہ ہو رہے گا۔ جان کا ڑھے میں نہ ڈالو۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا ۔ ہمتِ ایڈیٹراں مددِ دوستاں ۔ ہاں یہ اعلان کرنا ضروری ہوگا کہ نواب رائے اسٹاف میں داخل ہوگئے ۔ بس"۔

چنانچہ جون 1906ء کے شمارے میں "زمانہ" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں دیگر حضرات کے ساتھ مقبول مضمون نگار نواب رائے کے شامل ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ۔

www.taemeernews.com

4

ادب میں جمالیات کا بہت اہم مقام ہے اور کوئی ادبی بحث جمالیاتی اقدار کا تعین کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان اقدار کے تعین میں ادیبوں اور نقادوں میں بڑا بنیادی نظریاتی اختلاف رہا ہے۔ ہم آگے چل کر پریم چند کے جمالیاتی موقف پر کچھ تفصیل سے گفتگو کریں گے ہی لیکن یہاں بھی اس کے متعلق چند باتیں کہنا مناسب ہوگا۔ جیسا کہ اوپر ہم کہہ چکے ہیں پریم چند کی سماجی اور طبقاتی حیثیت نے ان کے سماجی، مذہبی اور ادبی نظریات پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ پریم چند اوپری طبقوں کے ادیبوں اور تخلیق کاروں کی طرح ادب کو محض ذہنی عیاشی یا زندگی سے فرار کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے یہاں جمالیات کا تصور سماوی نہیں ارضی تھا۔ وہ اسے محض ہیئت کے کھوکھلے تصور تک محدود کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اُس کا ناتا عوام کی زندگی سے جوڑنا ادیب کا بنیادی فرض سمجھتے تھے۔ ادب کے سماجی فرض کا احساس ان کے یہاں کتنا گہرا تھا اس کا اندازہ ہمیں اُس خط سے ہوتا ہے جو 1929ء میں انہوں نے دیا نرائن نگم کو بڑے طیش میں آکر لکھا تھا۔ یہ تو ہم پڑھ ہی چکے ہیں کہ دیا نرائن سے ان کے ذاتی مراسم بہت گہرے تھے اور وہ ان کا بڑا احترام بھی کرتے تھے۔ 1929ء کا دور ہندوستان کے لیے آزادی کی جدوجہد کے شباب کا دور تھا۔ ایسے بحرانی دور میں "زمانہ" کا

www.taemeernews.com

نومبر 1929ء میں "آتش نمبر" شائع ہوا تو پریم چند بھر گئے۔ اور اسی بپھرے ہوئے تیور سے دیانارائن نگم کو خط لکھا۔ یہ خط اس لیے اہم ہے کہ یہ پریم چند کے ادبی اور جمالیاتی نظریے پر روشنی ڈالتا ہے۔ خط میں چونکہ غصے کا اظہار ہے اس لیے اس کی ابتدا "برادرم" جو وہ عام طور پر نگم صاحب کو لکھا کرتے تھے کے بجائے بڑے رسمی انداز میں کی ہے:

مکرم بندہ نواز جناب ایڈیٹر صاحب "زمانہ" تسلیم

رسالہ "زمانہ" کا ماہ نومبر کا پرچہ دیکھ کر میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے جنہیں عرض کر دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ جناب کو ناگوار نہ ہوگا۔ اس زمانے میں جب کہ گوناگوں اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں، مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ رسالہ "زمانہ" کا قریب ایک لیے راہبر محض آتش کے کلام کے تبصرے کی نذر ہوگیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنوی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتاً کم ہے۔ مگر پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ بہ استثناء اُن حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور سبھی طبیعتوں کو موجودہ معیار اور ذوقِ صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع ہے تہذیب، اخلاق، مشاہدہ، جذبات، انکشافِ حقائق اور واردات و کیفیت قلب کا اظہار۔ جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانا، خنجر و محشر، بُشریٰ و خط، دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں۔ جن کی افتادِ طبیعت اس رنگ کی ہے اُنہیں اختیار ہے آتش یا ناسخ، رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں۔ لیکن زمانہ کے مختلف الطبع ناظرین کو اس وِرد اور وظیفے میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ مرزا جعفر علی خاں

www.taemeernews.com

صاحب نے اپنے تبصرے میں آتش کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے مگر اس انتخاب میں بھی بیشتر ایسے اشعار ہیں جنہیں ذوقِ لطیف ہرگز قابلِ ستائش نہ سمجھے گا۔ ملاحظہ ہو:

بھر گیا دامن نظارہ گلِ نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا

یہ خط اور بھی طویل ہے۔ لیکن کہنے کا مطلب یہی ہے کہ ایسا ادب دورِ انحطاط کا ادب ہے اور قوموں کو سُلانے والا، عیش و عشرت کی طرف موڑنے والا ادب ہے۔ یہ ادب انسان کو میدانِ عمل سے منھ موڑ کر کاخ و کو میں پناہ لینے اور حسن و عشق کے چٹخارے لینے کی دعوت دے کر اُس کی جدوجہد کی قوت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ منشی جی نے جس بپھرے ہوئے انداز میں اپنے عزیز ترین دوست کو خط لکھا ہے اس سے زندگی اور زندگی کی جدوجہد سے ان کی ادبی وابستگی کی شدّت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خیر یہ خط تو انہوں نے 1929ء میں لکھا ہے مگر 1905ء کے آس پاس ہی پریم چند ادب کا یہ نیا نظریہ اپنا چکے تھے۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں کے مجموعے "سوزِ وطن" کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ ہماری پوری توجہ چاہتا ہے۔ یہ مجموعہ 1908ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ دیباچے میں منشی جی رقم طراز ہیں:

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصّوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی

www.taemeernews.com

شروع ہوئی اور اصلاحِ تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص وحکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید ہی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حبّ وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے ہیں کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا ادب پر اثر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔"

یہی وہ زمانہ ہے جب پریم چند وطنِ عزیز کی جدوجہد آزادی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" حبِ وطن کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس مجموعے میں یہ کہانیاں شامل تھیں (1) دنیا کا سب سے انمول رتن (2) شیخ مخمور (3) یہی میرا وطن (4) صلۂ ماتم (5) عشق دنیا اور حبِ وطن۔

اس مجموعے کا پہلا فسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" ایک عاشق نوجوان دلفگار کے عشق کی کہانی ہے جو اپنی محبوبہ دلفریب کے عشق میں گرفتار ہے اور دلفگار سے اپنے عشق کے صلے میں دنیا کا سب سے انمول رتن طلب کرتی ہے۔ دل فگار اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ کئی چیزیں دِل فگار اپنی محبوبہ کو پیش کرتا ہے، مثلاً بیوی کی اپنے شوہر کی لاش پر جل کر خاکستر ہو جانے والی قربانی وغیرہ لیکن دلفریب ان کو دنیا کی سب سے قیمتی شے نہیں سمجھتی۔ آخر عاشق غم خوار ایک بزرگ کی رہنمائی میں ہندوستان آتا ہے جہاں اسے ایک میدان میں جنگ کا منظر نظر آیا۔ یہاں اسے کئی بہادر نوجوان خون میں لت پت تڑپتے ہوئے نظر آئے۔ وہ اس منظر سے دہل گیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک نوجوان کے سینے سے خون اُبل رہا تھا اور وہ دم توڑنے کو تھا۔ دلفگار نے اس سے پوچھا" اے

www.taemeernews.com

جواں مرد تو کون ہے" جواں مرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجے میں بولا:

"کیا تو نہیں جانتا میں کون ہوں۔ کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لختِ جگر ہوں" کچھ اور جواب سوال کے بعد سپاہی دلفگار سے کہتا ہے:

"افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیش ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں مگر ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیش کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھتا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کی گھاٹ اترے ہیں اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں مر رہا ہوں۔ سینے پہ کیا تو نے مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنی ہی ارض میں غلامی کرنے کے لیے زندہ ہوں؟ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں" اس طرح ایک سچے وطن پرست نے غلامی کے خلاف اپنے وطن پر جان دے دی اور اس کے سینے سے خون کا آخری قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے جلدی سے اس قطرۂ خون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے دنیا کی بیش قیمت شے سمجھ کر محبوبہ دلفریب کی طرف چل پڑا اور جب محبوبہ کو دکھایا اور ساری روداد سُنائی تو دلفریب مسرّت و خوشی سے جھوم اٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے صندوقچے میں سے ایک لوح نکالی جس پر لکھا تھا: "وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے قیمتی شے ہے"۔

فنّی اعتبار سے کہانی بڑی کمزور ہے اور ویسے بھی داستانی طرز میں لکھی گئی ہے۔ پریم چند ابھی تک کہانی کے لیے نئی راہ بنا نہیں سکے تھے۔ لیکن یہ داستان پھر بھی ایک معنیٰ میں مختلف تھی۔ اس میں حسن و عشق کی چاشنی ہوتے ہوئے بھی کہانی کا مقصد "حبِ وطن کی عظمت کا نقش" جمانا تھا۔ اس مجموعے کی دوسری کہانی صلۂ ماتم تکنیک کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ اور داستان طرازی سے

www.taemeernews.com

الگ راستہ بناتی ہے "عشق دنیا اور حب وطن" کا پس منظر تاریخ سے ابھرتا ہے۔ اٹلی کے محب وطن مینزینی کی زندگی پر اس کہانی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

ظاہر ہے یہ کہانیاں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات ابھارتی تھیں اور پریم چند نے اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر انہیں لکھا بھی تھا۔ اس وقت وہ نائب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز تھے، اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔" سوزِ وطن " کی کہانیاں انگریزی حکومت کے غیض و غضب کا باعث ہوئیں اور بہت جلد پتہ لگا لیا گیا کہ نواب رائے ایک سرکاری ملازم دھن پت رائے کا قلمی نام ہے۔ حکومت نے " سوزِ وطن " کی تمام کاپیوں کی ضبطی کا حکم جاری کیا۔ دھن پت رائے کو مجسٹریٹ کے سامنے حاضر رہنے کا حکم دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے جانے کی تفصیل خود پریم چند نے لکھی ہے :

" ایک دن میں رات کو اپنی راؤنڈ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے نام ضلع کے حاکم اعلیٰ کا پروانہ پہنچا کہ میں ان سے فوراً ملوں۔ جاڑوں کے دن تھے صاحب دورے پر تھے میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات چالیس میل طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ صاحب کے سامنے " سوزِ وطن " کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت میں نواب رائے کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ چل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور اس کی جواب دہی کے لیے مجھے بلایا گیا۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا: کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے ؟

میں نے تسلیم کیا۔ صاحب نے مجھ سے ایک ایک کہانی کا نفسِ مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے : " تمہاری کہانیوں میں باغیانہ خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ اپنی خوش نصیبی سمجھو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا۔ تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ لیے جاتے۔

www.taemeernews.com

تمہاری کہانیاں جانبدارانہ ہیں، تم نے انگریز سرکار کی توہین کی ہے "۔

جب پریم چند کانپور سے مہوبے کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو انڈین پریس، الہ آباد کے مالک چنتامنی گھوش نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ ایک اُردو ماہنامے کی ایڈیٹری قبول فرمائیں گے جو انڈین پریس سے جاری ہونے والا تھا۔ اس ملاقات میں ماہنامے کے نام کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ پریم چند نے " فردوس " نام تجویز کیا۔ لیکن انہیں سرکاری نوکری کی دقتوں اور دشواریوں کے پیش نظر ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات آڑے آئی۔ وہ بار بار سرکاری نوکری چھوڑنے پر آمادہ ہوتے۔ مگر آخری لمحے میں ہمیشہ ہچکچا جاتے۔ یہی صورتِ حال " زمانہ " کے معاملے میں بھی سامنے آئی۔ وہ " زمانہ " کے لیے کام اور کانپور میں قیام کرنے پر تیار تھے۔ مگر اس کے لیے ایک خاص رقم کی مالی ضمانت چاہتے تھے۔ لیکن اس میں بھی وہ آخری لمحے میں ڈگمگا گئے اور انکار کر دیا۔ اسی طرح بعد میں انہوں نے مارواڑی اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے نگم صاحب کو لکھا کہ وہ ہیڈ ماسٹری سے کم پر کسی طرح جانے کو تیار نہیں۔

اِدھر انگریزی سرکار کی طرف سے لکھنے لکھانے پر دھن پت رائے پر پابندی عاید کی گئی۔ ان کو سرکار سے عہد کرنا پڑا کہ اب وہ جو کچھ لکھیں گے اُسے کلکٹر کو دکھائے بغیر اور اُن کی اجازت حاصل کیے بغیر چھپوائیں گے نہیں۔ جب بیوی نے یہ قصہ سُنا تو بولیں " تو پھر لکھنا بھی بند ہی سمجھو "، لیکن دھن پت رائے اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ بولے " لکھوں گا کیوں نہیں۔ فرضی نام رکھنا پڑے گا "۔

اس کے بعد " زمانہ " مارچ 1910ء کے شمارے میں ان کی کہانی " گناہ کا اگنی کُنڈ " چھپی جس پر لکھنے والے کا نام " افسانہ کہن " دیا گیا ہے۔ اس کہانی سے اُس زمانے میں اُن کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نگم کے نام 1910ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" نواب رائے تو غالباً کچھ دنوں کے لیے اس جہان سے گئے۔ دوبارہ یاد دہانی ہوئی

www.taemeernews.com

ہے کہ تم نے معاہدے میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں کوئی مضمون خواہ ہاتھی دانت پر ہی کیوں نہ ہو لکھوں تو مجھے پہلے وہ جناب فیض یاب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا اور مجھے چھٹے چھ ماہے لکھنا نہیں۔ یہ تو میرا روز کا دھندا ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون جنابِ والا کی خدمت میں پہنچے گا تو وہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائضِ سرکاری میں خیانت کرتا ہوں اور کام میرے سر پر تھوپا جائے گا۔ اس لیے کچھ دنوں کے لیے نواب رائے مرحوم ہوئے ان کے جانشین کوئی اور صاحب ہوں گے۔"

نواب رائے کچھ دنوں کے لیے ہی نہیں ہمیشہ کے لیے مرحوم ہو گئے۔ اگلی کہانی "رانی سارندھا" زمانہ کے اگست، ستمبر 1910ء کے شمارے میں بغیر مصنف کے نام کے چھپی۔ ایک مضمون "ادیب" الہ آباد کے اگست 1910ء کے شمارے میں چھپا جس پر لکھنے والے کا نام صرف "د۔ر" لکھا ہوا ہے۔ ایک اور کہانی "بے غرض محسن" بھی اسی زمانے کی ہے مگر رسالہ دستیاب نہیں ہوتا اس لیے کہنا مشکل ہے کہ کس نام سے چھپی۔" سوزِ وطن" کے قضیے کے بعد بھی دھن پت رائے اپنا مجموعہ چھپوانا چاہتے تھے۔ اس لیے اب کسی نام کی تلاش ہوئی۔ آخر دیانرائن نگم نے ہی پریم چند نام تجویز کیا۔ دھن پت رائے کو پسند آیا۔ نگم کو لکھتے ہیں:

"پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ، چھ سال میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہی گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ نواب رائے ہمیشہ کے لیے قسمت کے لنڈورے ہو گئے اور پریم چند کی قسمت ایسی چمکی کہ آج بھی اردو اور ہندی ادب کی تاریخ میں یہ نام روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

پہلی کہانی جو پریم چند کے نام سے چھپی اس کا عنوان تھا "بڑے گھر کی بیٹی"۔ یہ کہانی "زمانہ" کے دسمبر 1910ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن یہ بات بھی یہاں نوٹ کرنا ضروری ہے کہ ابتدا میں پریم چند کے فرضی نام سے کہانیاں صرف "زمانہ" میں ہی شائع ہوتی رہیں۔ دوسرے رسالوں مثلاً "ادیب" وغیرہ میں وہ کچھ عرصے تک پرانے نام سے ہی لکھتے رہے جس کے لیے انہیں کلکٹر کی اجازت لینا ہوتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ کلکٹر یہی سمجھتا رہے کہ نواب رائے ان کی اجازت حاصل کر کے ہی کہانیاں اور مضامین چھپواتے ہیں۔ خود پریم چند نے "ادیب" کے ایڈیٹر پیارے لال شاکر کو ایک خط میں یہ وجہ بتائی ہے، "میں منشی دیانرائن نگم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پریم چند کے نام سے کسی اور پرچے میں نہ لکھوں گا۔ بلاوجہ ان کا دل دکھانا مجھے منظور نہیں۔"

پریم چند محض نام کی ہی تبدیلی ثابت نہیں ہوا بلکہ ان کے کہانی کے فن میں ایک نیا موڑ بھی۔ یہ نام اپنانے کے بعد جو کہانیاں لکھیں اُن میں داستان طرازی کا اثر کم ہوتا گیا اور ان کے فن میں پختگی آتی گئی۔ ویسے "بڑے گھر کی بیٹی" کو بھی ان کی اچھی کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ دنیا کی اچھی کہانیوں سے ٹکر لے سکتی ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے "بے غرض محسن" "آہ بے کس" "وکرمادتیہ کا تیغہ" "راج ہٹ" "منزلِ مقصود" "عالمِ بے عمل" "نمک کا داروغہ" "ممتا" وغیرہ کہانیاں لکھیں۔ ان میں سے کچھ کہانیوں پر راجستھانی تاریخ کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں پریم چند نے ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ ان کا ناول "جلوۂ ایثار" 1912ء میں انڈین پریس الہ آباد سے چھپا۔ پریم چند ناول نگاری کے فنی نظریات پر بھی غور کر رہے تھے۔ ناول نگاری پر ان کے خیالات کا اندازہ ہمیں ان کے ایک مضمون "اردو زبان اور ناول" سے ہوتا ہے جو "ادیب" کے اگست 1910ء کے شمارے میں "د۔ ر" کے نام سے چھپا تھا۔ ناول سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

www.taemeernews.com

"صرف امیر لوگ ہی تاریخ ، سیاست ، فلسفہ ، حساب کا مطالعہ کر سکتے ہیں مگر آبادی کا بہت بڑا حصہ وہی ہے جسے 24 گھنٹوں میں سے 12 گھنٹے فکرِ معاش کی نذر کرنا پڑتے ہیں ۔ یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ بھی نہیں پڑھ سکتے ..... ناول نویسوں کو بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اردو ناول کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے ۔ انہیں استادانِ فن کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے ۔ ان کا فرض ہے کہ طبع انسانی کا نظرِ غائر سے مشاہدہ کریں اور سچے جذبات کے نمونے پیش کریں ۔ پبلک کا ادبی معیار روز بروز اونچا ہوتا جا رہا ہے اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان میں بھی وہی خوبیاں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں جن کی ان کی نگاہ عادی ہو رہی ہے .... ناول لکھنا آسان کام نہیں ۔ شاید کسی صنفِ ادب میں اس قدر جدتِ خیال ، اس قدر دماغی انہماک ، اور اس قدر تخیل کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ انہیں راتیں خیال میں ڈوب کر کاٹنی ہوں گی ۔ انہیں صبح و شام تنہا پُر فضا مقامات کی سیر کرنی ہوگی ۔ انہیں اساتذہ کے کلام کی خوشہ چینی کرنی ہوگی تب کہیں اُن کے قلم سے پُر زور ناول نکلے گا ۔"

اس اقتباس سے ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ پریم چند شروع سے ہی ناول نگاری کی تکنیک اور فنی مسائل سے اچھی طرح آگاہ تھے ۔ وہ نہ صرف ناول لکھنے کی طرف توجہ دے رہے تھے بلکہ ناول نگاری کے فنی نظریات پر بھی اچھی خاصی نگاہ رکھتے تھے ۔ ایک باشعور فن کار کے لیے یہ بہت ہی ضروری بات ہے ۔ پریم چند ، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ، ایک طرف ادب میں سماجی ذمہ داری کے قائل تھے تو دوسری طرف ، جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے ، ادب میں فنی اور جمالیاتی تقاضوں سے بھی کسی طرح غافل رہنا نہیں چاہتے تھے ۔ سماجی ذمے داری اور فنی اور جمالیاتی تقاضوں کا یہ توازن قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے اور ایسا توازن ہمیں بڑے ادیبوں اور فن کاروں کے یہاں ہی ملتا ہے ۔

www.taemeernews.com

اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو پریم چند کا ناول "جلوۂ ایثار" ہمیں مایوس کرے گا کیوں کہ اس میں وہ تمام فنی خوبیاں نہیں ہیں جن کا ذکر پریم چند نے ناول پر اپنے مضمون میں کیا ہے تاہم 1912ء میں جلوۂ ایثار خاصے کی چیز تھی۔ یہ ناول حبِ وطن، خود اعتمادی اور خدمتِ خلق کے جذبے سے پُر ہے۔ غیر ملکی حکومت اور اس کے مظالم کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے۔

www.taemeernews.com

5

اب ہم ادھر ایک نظر منشی جی کی گھریلو زندگی پر بھی ڈالتے چلیں ۔ دھن پت رائے کی پہلی بیوی سیرت اور صورت دونوں لحاظ سے ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی ۔ آئے دن کے جھگڑوں سے وہ خود تنگ آ چکے تھے ۔ آخر وہ کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی ۔ پریم چند خود اس رشتے سے نالاں تھے ۔ وہ بھی اسے لینے نہ گئے ۔ شیورانی دیوی (اُن کی دوسری بیوی) سے اس کا انہوں نے یوں تذکرہ کیا تھا :

"چھٹیوں کے دن تھے ۔ میں گھر آیا ۔ انہیں دنوں مجھ میں اور میری بیوی میں جھگڑا ہو گیا ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چاچی نے بھی ان کی کافی شکایت کی ۔ غصے میں آکر میں نے ان کو ڈانٹا وہ بھی مجھ پر جھلائی میں نے کہا اس سے بہتر ہوگا تم اپنے گھر جاؤ ۔ میں نے وجے بہادر سے کہا ان کو پہنچا آؤ ۔ میرا کہنا تھا کہ وہ انہیں پہنچا آئے ۔"

اسی طرح کچھ عرصہ بیت گیا اور پھر چاچی دوسری شادی کے لیے اصرار کرتی رہی ۔ پہلے تو پریم چند اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے ۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید پہلی بیوی لوٹ آئے ۔ آخر کچھ سالوں کے انتظار کے بعد دوبارہ شادی کا ارادہ کر لیا ۔ منشی جی آریہ سماج کی اصلاحی تحریک سے تعلق رکھتے تھے اس لیے

www.taemeernews.com

پریم چند اپنی اہلیہ شیورانی کے ساتھ

وہ دوسری شادی کسی کم عمر کنواری لڑکی سے کرنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ انہوں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کسی ودھوا (بیوہ) سے ہی شادی کریں گے اور اس طرح اپنے اپدیشوں پر عمل کر کے بھی دکھا دیں گے ۔ گھر والے ظاہر ہے ان کی ان باتوں کے خلاف تھے ۔ لیکن منشی جی بھی اپنی دھن کے پکے تھے ۔

سیم پور ضلع فتح پور کے منشی دیوی پرشاد کی لڑکی شیورانی گیارہ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی ۔ شیورانی کے والد بھی چاہتے تھے کہ ان کی لڑکی کی دوسری شادی ہو جائے ۔ انہوں نے رشتے کے لیے پنڈتوں سے بھی کہا اور اخبار میں بھی اشتہار نکلوایا ۔ جواب میں کئی خطوط آئے ان میں ایک خط دھن پت رائے کا بھی تھا اور انہیں سے بات پکی ہو گئی ۔ پریم چند نے گھر والوں کو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس کی خبر نہ ہونے دی ۔ دھن پت رائے کی دوسری بیوی کے ساتھ بھی ان کی سوتیلی ماں کا برتاؤ اچھا نہ تھا ۔ ایک عرصے تک وہ اپنے میکے میں

www.taemeernews.com

رہتی تھیں۔ پریم چند کی دوسری شادی 1906ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں کسی بیوہ سے شادی کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

پریم چند کی سرکاری نوکری میں 1909ء میں ترقی ہوئی اور انہیں ڈسٹرکٹ بورڈ ہمیرپور کے تحت سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز مقرر کیا گیا۔ 24 جون 1909ء کو مہوبا میں انہوں نے اپنا نیا عہدہ سنبھالا۔ اب انہیں اکثر گھر سے باہر اسکول کے دوروں پہ جانا پڑتا اور دو جے بہادر گھر کی دیکھ بھال کرتے رہتے۔ مہوبا میں وہ کائستھوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہاں یہ بھی رواج تھا کہ سرکاری افسر لوگوں سے دودھ، گھی وغیرہ مفت منگا لیتے اور بیگار بھی لینے میں نہ جھجکتے۔ منشی جی کو یہ سب باتیں بالکل پسند نہ تھیں۔ چند لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی کہ اگر آپ نہ لیں گے تو پھر یہ رسم ہی ختم ہو جائے گی۔ بہت دباؤ ڈالنے پر منشی جی نے اپنے نوکروں کو یہ نذرانہ لینے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح مقامی رواج کے مطابق جب تلک لگا کر روپیہ پیش کیا جاتا تو وہ دہی چاول اور پان کا بیڑہ تو لے لیتے مگر روپیہ لینے پر راضی نہ ہوتے۔

وہ معائنہ کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے اور اپنے گھوڑے کو بڑے دلار سے رکھتے۔ سردیوں میں گھوڑے کو دوشالہ اڑھاتے۔ بیل گاڑی خریدنے پر سرکار الگ سے بھتہ دیتی تھی لیکن خریدنے کے لیے روپیوں کا انتظام نہ تھا۔ آخر شیورانی دیوی نے اپنی بچت سے ایک سو پچاس روپے دیئے تو بیل گاڑی خریدی گئی۔ پریم چند کا اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی برتاؤ بہت اچھا ہوتا۔ ان کی ترقی کرنے کی فکر میں رہتے۔ شیورانی دیوی اس کے متعلق لکھتی ہیں: "آپ کو اپنے افسروں کی ہمدردی تو ملی نہیں ماتحتوں کے ساتھ آپ نے بھائی چارہ ہمیشہ رکھا۔ کیونکہ افسری کرنا آپ کو پسند نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ افسر بن کر انسان انسان نہیں رہ جاتا۔ ایشور مجھے اس سے دور رکھے۔"

انہوں نے کبھی کبھی سرکاری ملازمت ترک کر دینے کا بھی ارادہ کیا مگر ان دنوں وہ یہ فیصلہ کن قدم اٹھا نہ سکے۔ تذبذب میں ہی رہے۔ کبھی کبھی صحافت کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی اور اخبار سے وابستہ

www.taemeernews.com

ہو جانے کا ارادہ کیا لیکن فیصلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ نگم نے پریم چند کو 'اودھ اخبار' کے اسٹاف میں شامل ہونے کے متعلق لکھا تو جواب یوں دیا:

"اودھ اخبار والے معاملے میں کیا جواب دوں۔ مالی پہلو یہ ہے کہ یہاں کل آمدنی 80 روپے سے کسی طرح زائد نہیں ہے۔ دورے کا خرچ اور ملازموں کی تنخواہ اس میں شامل نہیں ہے۔ قریب قریب یہی حالت وہاں بھی ہوگی اور مصارف بدستور۔ مگر کام میں بڑا فرق ہے۔ یہاں بہت آزادی ہے۔ باوجود غلامی کے چونکہ کوئی افسر سر پر سوار نہیں رہتا اور نہ کوئی جواب دہی ہے۔ اس لیے آزادی سی معلوم ہوتی ہے۔ دس بجے سے پانچ بجے تک کی حاضری، دماغی کام، روزانہ اخبار جی کانپ جاتا ہے۔ ہمت نہیں پڑتی۔ یہاں لٹریری کام بمنزلہ تفریح ہے وہاں یہ معاش ہو جائے گا۔"

ویسے وہ اپنے دوست نگم کی اخبار و رسائل نکالنے میں ہر طرح مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ دیانرائن نگم نے 1912ء میں ایک اردو ہفتہ وار اخبار نکالنے کا ارادہ کیا تو پریم چند نے انہیں یوں رائے دی: "آپ کا ہفتہ وار 'کامریڈ' کے نمونے کا ہونا چاہیے مگر پالیسی ہندو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا اور اس کی کوشش فضول ہے۔" پریم چند کے اس خط سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور اس کا سہارا لے کر بعض دوستوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام بھی لگایا ہے۔ لیکن یہ الزام انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ہم آگے چل کر اس سوال پر کچھ تفصیل سے بحث کریں گے۔ منشی دیانرائن نے اپنا ہفتہ وار 'رفتار زمانہ' کے نام سے نکالنا طے کیا۔ پریم چند نے اس کام میں اُن کی مدد کرنے کا یقین دلاتے ہوئے لکھا:

"آپ تنہا ایک اسسٹنٹ کی مدد سے ہفتہ وار اخبار اسی حالت میں چلا سکیں گے جب قلم کو زیادہ رواں بنائیں۔ میں ہفتہ وار ایک دو صفحے بلاناغہ آپ کی خدمت میں بھیج دیا کروں گا۔ کچھ نوٹ ہوں گے، بن پڑا تو کوئی ایڈیٹوریل کبھی کسی مضمون کا ترجمہ کبھی

www.taemeernews.com

کچھ .... مجھ سے جو مدد ہو سکے گی کرتا رہوں گا۔"

کسی اخبار سے باقاعدہ وابستہ نہ ہونے کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ براہ راست کسی کی ماتحتی میں کام کرنا اپنے مزاج کے خلاف پاتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "میں جو عاجز ہوں وہ ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آوے تو رات دن کام کرتا رہوں اور جی چاہے تو فوراً کر دوں، مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے"۔ نجی کاروبار کے لیے روپے پیسوں کی ضرورت تھی اور روپیہ پریم چند کے پاس تھا نہیں۔ چنانچہ اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

"میرے لیے تو اب یہی مناسب ہے کہ کسی پرائیویٹ اسکول کی ماسٹری کر لوں جہاں سے پچاس روپے ماہوار ملے۔ اسی کے ساتھ ساتھ "زمانہ" اور "آزاد" کی خدمت کروں۔ اس طرح مجھے ساٹھ ستر روپے ماہوار کا اوسط پڑتا جائے۔ اس سے زیادہ کی خواہش نہیں اور نہ اس سے زیادہ پا سکتا ہوں۔ خواہ مخواہ تقدیر سے کیوں لڑوں"۔

اور زیادہ سے زیادہ یہ خواہش رکھتے تھے کہ:

"کچھ کتابیں لکھوں گا۔ کچھ اپنی کتابیں چھپواؤں گا۔ پانچ. چھ سو روپے میری کمائی ہے اسے انہی کاموں میں صرف کروں گا اور بالآخر جب لٹریری شہرت حاصل کروں گا تو کوئی ماہوار سالہ نکال کر گذر کروں گا اور اگر اس سے پہلے حیات نے جواب دے دیا تو پھر رام نام ستیہ ہے"۔

جب پریم چند کا قیام بستی میں تھا تو پیچش کی شکایت بڑھ گئی۔ چھ مہینے کی رخصت لی تاکہ باقاعدہ علاج کرا سکیں۔ لکھنؤ میڈیکل کالج کے علاج سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ کاشی میں ایک حکیم سے رجوع کیا۔ تین چار مہینے کے علاج سے افاقہ تو ہوا لیکن بیماری جڑ سے نہیں گئی۔ ایسی حالت میں پریم چند ایسی ملازمت سے وابستہ نہیں رہنا چاہتے تھے جس میں بار بار مختلف علاقوں کے دوروں پر جانا پڑے۔ وہ

www.taemeernews.com

ٹیچر شپ کے لیے کوشش کرنے لگے اور آخر 1915ء میں بستی میں ہی انہیں پچاس روپے ماہوار پر سیکنڈ ماسٹر کی نوکری مل گئی۔ ان کے بستی کے قیام کے دوران ہی پریم پچیسی کا پہلا حصہ شائع ہوا جس میں کل ملا کر بارہ کہانیاں تھیں۔ اسی زمانے میں پریم چند ہندی کے بعض ادیبوں سے قریب آئے اور ہندی میں لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ "سرسوتی" کو ان کی پہلی کہانی بستی ہی سے بھیجی گئی تھی۔

www.taemeernews.com

6

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہندوستان کے لیے بڑا ہنگامی دور تھا۔ انگریزی سامراج کے لیے اب نئے چیلنج پیدا ہو رہے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی اب تک انگریزی حکومت سے درخواستوں کے ذریعے ہندوستانی رعایا کے لیے سہولتیں حاصل کرنے کی رہی تھی۔ لیکن اب نئی پیڑھی محض چند سہولتوں سے مطمئن ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس پیڑھی میں قومی حمیت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور قومی آزادی کے لیے تڑپ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں ہی بنگال اور کچھ دوسرے علاقوں میں چند نوجوانوں نے خفیہ دہشت پسند گروہ بنا لیے تھے۔ جن کا نشانہ انگریز حکمراں طبقے کے اراکین ہوتے تھے۔ خود انڈین نیشنل کانگریس میں بھی اب زیادہ گرمجوش اور جنگجو پالیسی پر چلنے والے رہنما پیدا ہو رہے تھے جن کی نمائندگی تلک کر رہے تھے۔ کانگریس لیڈر شپ کا یہ گروہ نرم اور محض درخواست کرنے والی پالیسی کی سختی سے مخالفت کر رہا تھا۔ مزدور اور محنت کش طبقوں میں بھی بے چینی کی لہر پیدا ہو چلی تھی اور ظاہر ہے ان نچلے طبقوں کی نمائندگی وہی کر سکتا تھا جو انگریز حکمرانوں سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تلک اس دور میں ہندوستان کے سیاسی افق پر آندھی کی طرح چھا گئے تھے۔ تلک پر انگریز حکومت نے بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا اور پہلے انہیں ڈیڑھ سال کی قید بامشقت کی سزا ہوئی (لیکن کچھ لوگوں

www.taemeernews.com

کی درخواست پر انہیں ایک سال کے بعد رہا کر دیا گیا) اور بعد میں 1908ء میں انہیں جلا وطن کر کے مانڈلے بھیجا گیا۔ قوم پرست تلک کے خلاف انگریزوں کے اس ظالمانہ رویہ نے سارے ہندوستان میں جیسے آگ لگا دی۔ مزدوروں نے بھی احتجاجاً ہڑتال کر کے اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیا۔

تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات نے کانگریس میں دو گروہ پیدا کر دیے۔ ایک گروہ جس کی رہنمائی گوپال کرشن گوکھلے کر رہے تھے 'نرم دل' کہلاتا تھا اور دوسرا گروہ جس کی رہنمائی تلک کر رہے تھے "گرم دل" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ملک کے اکثر نوجوانوں کی ہمدردی ظاہر ہے آخری گروہ کے ساتھ تھی، کیونکہ یہی گروہ ان کے سیاسی جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ بھلا ایسے حالات میں پریم چند کیسے ملک کی سیاست سے الگ رہ سکتے تھے۔ ان کے دل میں بھی وطن کی آزادی کے جذبات موجزن تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور اپنے جذبات کے اظہار میں وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ پھر بھی اپنے قلم کے زور سے اور تخلیقی ادب کے ذریعے انہوں نے صدق دلی سے اپنے حبِ وطن کا ثبوت دیا اور نتیجے میں، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، ان کی کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" انگریز سرکار نے ضبط کر لیا اور نوجوان قلم کار کو آئندہ ایسی کہانیاں نہ لکھنے کی سخت تنبیہہ کی گئی۔ لیکن منشی جی ڈرے نہیں اور نام بدل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔

پریم چند کا جھکاؤ بھی نرم دل کے مقابلے میں گرم دل کی طرف تھا اور وہ تلک کا بڑا احترام کرتے تھے۔ نگم صاحب، جو اُن کے بڑے عزیز دوست تھے، نے خود اس کی گواہی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "پریم چند نابرابر کی لڑائی میں سمجھوتے کے خیال کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ اس کے لیے عوام کو جلد سے جلد تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت سے سخت ٹکر لیے بغیر کام نہ چلے گا۔۔۔۔" امرت رائے بھی لکھتے ہیں کہ "کانگریس کے اندر تلک کا آمد دلن اور کانگریس کے باہر انقلابیوں کی سرگرمیاں اور ان پر سرکار کی طرف سے کیا جانے والا ظالمانہ

www.taemeernews.com

برتاؤ روز بروز منشی جی کے من کو باغی بناتا جارہا تھا اور جب 11 اگست 1908ء کو خودی رام کو پھانسی ہوگئی تو اُن کے دِل سے سمجھوتے کی بات، کسی طرح کے سمجھوتے کی بات، ہمیشہ کے لیے رُخصت ہوگئی۔ اُس دن کے بعد سے اُن کے اور سرکار کے بیچ خودی رام کی لاش تھی۔" چنانچہ اس دور کی کہانیوں میں ہمیں اکثر بہادری، قوم پرستی اور ایثار کے جذبات ملتے ہیں۔ وہ جب اپنی کہانیوں کو ترتیب دینا چاہتے ہیں تو انہیں عنوان بھی ایسے ہی سوجھتے ہیں۔ چنانچہ مہوبا سے اپنے ایک خط میں دیا زائن نگم کو لکھتے ہیں۔ "ترتیب کیونکر دوں۔ ابواب کی صورت میں نہیں آتے ورنہ میں نے چاہا تھا کہ شجاعت، خودداری، ایثار وغیرہ کے عنوان سے ترتیب دوں۔"

وطن کی آزادی پریم چند کی زندگی کا اوّلین مقصد تھا۔ انہوں نے اپنا قلم اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ 1935ء میں پنڈت بنارسی داس چترویدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میری تمنائیں کچھ نہیں ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ ہم آزادی کی لڑائی میں فتحیاب ہوں۔ دولت یا کامیابی کی آرزو مجھے نہیں رہی۔ کھانے بھر کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھوں۔ لیکن اُن کا مقصد بھی سوراجیہ کی جیت ہی ہو۔ ..... میں شانتی سے بیٹھنا بھی نہیں چاہتا۔ ادب اور سودیش کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں۔" اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے اپنی فکر اور اپنی تحریروں کو وطن کی آزادی کے لیے وقف کر دینا ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا تھا۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے درمیانی عرصے تک وہ ایک ادیب اور کہانی کار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے اور وہ چاہتے تو بڑے آرام سے اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے انہیں ایسے لوگوں سے سمجھوتا کرنا پڑتا جو انگریز سرکار کے وفادار تھے اور ملک کی آزادی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب مہاراجہ الور کی طرف سے انہیں پیش کش کی گئی کہ اگر وہ ان کی ملازمت قبول کر لیں تو انہیں چار سو روپے مشاہرہ ملے گا اور رہنے کو بنگلہ اور موٹر اس کے علاوہ،

www.taemeernews.com

تو پریم چند نے اسے ٹھکرا دیا۔ ایک ادیب اور فن کار کو کیا چاہیے۔ بنگلہ، موٹر اور معقول آمدنی تاکہ اطمینان سے وہ کام کر سکے اپنی تخلیق اور تحریر کا۔ پریم چند بھی یہ راستہ اختیار کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے اُصولوں کا خون کر کے ایسی زندگی گذارنا نہیں چاہتے تھے۔ راجے مہاراجے آخر انگریزوں کے وفادار تھے۔ اُن کی حکومت کے ستون تھے۔ وہ ایسے ہی ایک ستون کا سہارا لے کر کیسے جینا گوارا کر سکتے تھے؟

آزادی کی تحریک میں دل وجان سے کون شریک ہیں اور کون نہیں اس کے متعلق پریم چند کا ذہن بالکل صاف تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ان کے طبقاتی کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ رائے بہادر اور خان بہادر، نواب اور راجے اپنے طبقاتی مفاد کی حفاظت کی خاطر انگریزوں کے حامی تھے اُن کی ہمدردی تحریکِ آزادی سے کس طرح ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے طبقاتی مفادات کو عوام کی اُمنگوں پر کیسے بھینٹ چڑھا سکتے تھے۔ پریم چند لکھتے ہیں "ہاں ہم یہ ماننے کو تیار ہیں کہ ہمارے خان بہادران صاحبان، جن کی تعداد ایشور کی دیا سے، انگریزوں کی لامحدود ہمدردی کے باوجود بہت زیادہ نہیں بیشک ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔۔۔۔ خان صاحب نہیں ہیں تو رائے صاحب بھی تو نہیں ہیں یوں کہیے کہ یہ اُن لوگوں کی تحریک ہے (تحریک آزادی کی طرف اشارہ ہے) جو اپنی تمام تکلیفوں کا حل صرف دیش کی آزادی کو ہی سمجھتے ہیں جو غریب ہیں، بھوکے ہیں، دلت ہیں، یا جو غیرت سے بھرا ہوا، فخرِ وطن سے چمکتا ہوا دل رکھتے ہیں اور یہ دیکھ کر جن کا خون کھولنے لگتا ہے کہ کوئی دوسرا ہم پر حکومت کرے۔ اس میں نہ ہندو کی قید ہے نہ مسلمان کی۔ جو شخص ایسے پاکیزہ جذبات رکھتا ہو، جس کے دل میں وطن کی آزادی کا جذبہ اس شان سے موجزن ہو، جو غریب اور کچلے ہوئے عوام سے اس قدر ہمدردی رکھتا ہو بھلا وہ کیونکر مہاراجہ الور کی پیش کش کو قبول کر سکتا ہے؟ اپنے عیش و عشرت کے لیے منشی جی ہرگز وطن کی آزادی کا سودا نہیں کر سکتے تھے۔

1930ء میں جب نمک پر ٹیکس لگائے جانے کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے گاندھی جی نے ڈانڈی جا کر نمک بنانے کی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے "ہنس" والی۔۔ میں لکھا:

www.taemeernews.com

"پہلے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کی مہاتما جی کیا کرنے جا رہے ہیں۔ مذاق بھی اڑایا گیا۔ ایک گورنر نے اپنے خوشامدی ٹٹوؤں کو جمع کر کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے اس سنگرام کو المناک حادثہ بتایا، گورنر صاحب کو کیا معلوم تھا کہ یہ المناک حادثہ دو ہفتے میں ہی آزادی کی ایک زبردست لہر ثابت ہوگا۔ جسے نوکر شاہی کی ساری منظم قوت بھی نہ روک سکے گی۔ وہ سب کیا گیا جو ایسی حالت میں ایک خود مختار حکومت کیا کرتی ہے۔ ہمارے لیڈر چُن چُن کر جیل بھیج دیے گئے.... لیکن سوراجیہ کی فوج کے قدم آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ کہیں نہتی جنتا پر ڈنڈوں اور گولیوں کی بوچھار ہو رہی ہے، کہیں جنتا میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ فلموں پر روک لگائی جا رہی ہے، تار کی خبروں کا سنسر ہو رہا ہے.... نہ کوئی قانون ہے نہ کوئی قاعدہ، نہ نیتی نہ دھرم.... مگر ہم ان باتوں کی شکایت نہیں کرتے۔ انہی بے انصافیوں سے تو ہماری فتح ہے.... ہم تو مہاتما جی کی سوجھ بوجھ کے قائل ہیں۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ نہ جانے کہاں سے نمک قانون کھوج نکالا کہ اُس نے دیکھتے دیکھتے ہی دیش میں آگ لگا دی.... انگریزی حکومت سے پہلے یہ کر کبھی نہ لگایا گیا تھا۔ آج بھی دنیا بھر میں بھارت ہی ایک ایسا دیش ہے، جہاں نمک کر لگایا جاتا ہے۔ مسلم علمائے تو نمک، ہوا اور پانی پر کر لگانا حرام قرار دیا ہے۔ پر ہم 150 برس سے یہ کر دیتے آئے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ جس چیز پر دو آنے من لاگت آتی ہے اُس پر بیس آنے من کر لیا جاتا ہے.... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کر کو اجتماعی شکل میں نہایت آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔ ایسا کوئی زمین کا حصہ نہیں جہاں لونی مٹی نہ ہو اور شہر اور گاؤں دونوں ہی جگہوں سے آدمی بڑی تعداد میں جمع ہو کر اسے توڑ سکتے ہیں اور سرکاری نمک کو بازار سے نکال باہر کر سکتے ہیں"۔

www.taemeernews.com

دراصل نمک ستیہ گرہ کے پیچھے ہندوستانی عوام کا جذبۂ آزادی ہی کام کر رہا تھا۔ اگر سینے میں یہ آزادی کی تڑپ نہ ہوتی تو لاکھوں کی تعداد میں اس طرح لوگ اس میں شریک نہ ہوتے۔ پریم چند کے سینے میں بھی یہی تڑپ ہے جو اُن کے قلم کو جنبش دیتی ہے اور مہاتما گاندھی کے لیے ان کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ خلافت تحریک اور ترکِ موالات کی تحریک کا بھی پریم چند نے پوری گرمجوشی سے استقبال کیا۔ امتیاز علی تاج کو 29 دسمبر 1921ء میں انہوں نے ایک خط میں لکھا: "میں بھی ترکِ موالاتی ہوں۔ میرے دل و دماغ میں بھی آج کل وہی مسائل گونجا کرتے ہیں۔" عدم تعاون اور خلافت تحریک کو ہر طرح سے طاقت ور بنانا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ مضامین لکھے۔ قصّے کہانیاں لکھیں۔ ناول لکھے۔ جس طرح بھی وہ آزادی کی اپنی تڑپ کو لوگوں تک پہنچا سکتے تھے۔ پہنچاتے رہے۔ ان کے ناول "میدانِ عمل" میں جو اگست 1932ء میں شائع ہوا، آزادی کا یہ جذبہ ہمیں پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ پرکاش چندر گپت لکھتے ہیں "کرم بھومی" (میدانِ عمل) اپنے انقلابی جوش کی بنا پر اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔ ہر طرف لوگ حرکت میں ہیں، جنہیں ٹوکنے یا روکنے والی طاقت مفقود ہے۔ شہر اور دیہات میں، پہاڑوں اور وادیوں میں ایک زلزلہ سا آگیا ہے۔ کوئی جبر و تشدد انہیں نہیں دبا سکتا۔ یہ بغاوت پر آمادہ ہندوستان کی تصویر ہے۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد جیسے ہیرو میدان میں اُتر آئے تھے۔ جواہر لال نہرو نے لاہور کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا 'میں ری پبلیکن اور سوشلسٹ ہوں۔' "کرم بھومی" میں اس ہلا دینے والے وقت کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے۔ گورکی کی تصنیف ماں کی طرح یہ ناول بھی بتاتا ہے کہ انقلاب کس طرح آتا ہے۔"

جب تحریکِ آزادی زوروں پر تھی تو پریم چند سرکاری نوکری میں گھٹن محسوس کرنے لگے اور ملازمت کی غلامی سے مستعفی ہونے کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ ان کی بیوی شیورانی دیوی بھی اس کے حق میں تھیں۔

www.taemeernews.com

عدم تعاون کی تحریک کے درمیان جب استاد اور طالب علم اسکول اور کالج چھوڑ رہے تھے، وکیل کچہریوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے اور سرکاری نوکر اپنے عہدوں سے الگ ہو رہے تھے تو بھلا پریم چند جیسا حساس ادیب کیسے سرکاری نوکری پر قائم رہ سکتا تھا۔ پھر بھی کوئی اور آسرا نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے لیے یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ کچھ دنوں تک شش و پنج کی حالت میں رہے، اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ انہی دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ خود پریم چند نے اس دورے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ کیا شہر، کیا دیہات، عقیدت مند پبلک دوڑی آتی تھی۔ ایسا مجمع میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔" استعفا دینے سے پہلے جب انہوں نے اپنی بیوی سے مشورہ طلب کیا تو فوراً وہ کوئی جواب نہ دے سکیں۔ اس تذبذب کا حال خود شیورانی دیوی نے بیان کیا ہے :

"جو اُلجھن ان کو تھی وہی دو تین دن مجھے بھی ہوئی۔ مجھے بھی بار بار یہی خیال ہوتا کہ آخر بی اے کی خواہش کیوں ہوئی، یہی نہ کہ آگے ترقی کی آشا۔ پہلے تو یہ خیال تھا کہ یہ کبھی پروفیسر ہو جائیں گے اور جیون کے دن آرام سے کٹیں گے، کیونکہ صحت اچھی نہ تھی۔ اور کہاں یہ تجویز کہ جو کچھ ملتا ہے اس کو بھی چھوڑ کر محض ہوا میں اُڑا جائے۔ اُس وقت ان کو کُل ملا کر ایک سو پچیس کے قریب ملتا تھا۔ اسکول کی نوکری ہونے کی وجہ سے گھر پر بھی کام کرنے کا وقت مل جاتا تھا۔ مجھے بھی اس بات کی اُلجھن تھی کہ آخر نوکری چھوڑ کر کریں گے کیا؟ ایک لڑکی اور ایک لڑکا سامنے تھا، اور ابھی بچے ہونے کی امید تھی .... اُدھر میری خواہش یہ بھی نہ تھی کہ کسی کے پیر کی بیڑی بن کر رہوں .... یہ نہیں کہ

www.taemeernews.com

روپیوں کی قیمت میری آنکھوں میں کم تھی۔ ایک تو اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے، خود بھی بہت دنوں سے بیمار، نہ گھر نہ دوار۔ ان سب باتوں کو سوچ کر یہی دل میں آتا تھا کہ اِن کو نوکری چھوڑنے سے روک دوں۔ دو روز کا وقت لیا تھا لیکن چار پانچ دن میں بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ چار پانچ دن کے بعد انہوں نے پھر پوچھا کہ بتلاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا۔ میں بولی۔ ایک دن کا وقت اور۔ اس دن میں نے یہ سوچا کہ آخر جب یہ اتنے بیمار تھے اور بچنے کی کوئی آشا نہ تھی، ایک طرح سے شاید انہوں نے مجھے جواب ہی دے دیا تھا، یہ کہہ کر کہ یہ تین ہزار روپے ہیں اور تین تم۔ ایشور کچھ اچھا ہی کرنے والا ہوگا تبھی تو یہ اچھے ہو گئے ہیں۔

دوسرے دن میں نے اُن سے کہا۔ چھوڑ دیجیے نوکری کو۔ یہ سرکاری نیتی اب قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ اب آپ اپنی فطری ہنسی ہنس کر بولے۔ دوسروں کا خاتمہ کرنے سے پہلے خود اپنا انجام سوچ لو۔' میں نے سوچ لیا ہے۔ جب تم اچھے ہو گئے ہو تو میں سوچتی ہوں کہ اب آگے بھی جنگل میں منگل کر سکوں گی اور میرا خیال ہے کہ ایشور کچھ اچھا ہی کرنے والا ہے۔' سوچ لو، پھر نہ کہنا کہ چھوڑ کر خود بھی تکلیف اٹھائی اور مجھے تکلیف دی کیوں کہ سر پر تکلیفیں آگے بہت آنے والی ہیں، ممکن ہے کھانے کو بھی نہ ملے۔ میں اس کے لیے سوچ چکی ہوں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ سر پر جب بلا آتی ہے تب ہر کوئی بھگت لیتا ہے۔ پھر بھگتتے تو ہیں بڑے بڑے لوگ، اپنی تو بساط ہی کیا ہے۔"

بیوی کے یہ تیور دیکھ کر پریم چند نے سرکاری ملازمت ترک کر دینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر شری بچن لال پریم چند کے قدر دانوں میں سے تھے۔ جب پریم چند نے ان کو اپنا ارادہ بتایا تو اُنہیں یقین نہ آیا کہ ایک آدمی جو اتنی لمبی بیماری سے ابھی ابھی اٹھا ہے، اپنی سرکاری ملازمت ترک

www.taemeernews.com

کر دینا چاہتا ہے ۔ انہوں نے پریم چند کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی اور کہا کہ میں آپ کا استعفا بھی آگے نہیں بھیجوں گا آپ ایک بار اور سوچ لیجیے ۔ پریم چند اپنے ارادے پر قائم رہے اور بولے میں کل سے کام پر نہیں آؤں گا ۔" میری آتما نہیں چاہ رہی ہے، ہیڈ ماسٹر صاحب میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں"۔ مدن گوپال اپنی کتاب "قلم کا مزدور" میں لکھتے ہیں :" اسکول کے کاغذوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ پریم چند نے نان کوآپریشن تحریک کی وجہ سے استعفا دیا اور ان کی نوکری 16 فروری 1921ء کو ختم ہوئی ۔ ان کے استعفے کے تحریری کاغذات موجود نہیں "۔ انہوں نے استعفے میں کیا لکھا ہوگا اس کا اندازہ ہمیں ان کی جولائی 1921ء کی لکھی ہوئی ایک کہانی " لال فیتہ "کے ہیرو ہری بلاس کے استعفے کے الفاظ سے ہو سکتا ہے ۔ ہری بلاس بھی ترکِ موالات کی تحریک سے متاثر ہو کر سرکاری نوکری سے استعفا دیتا ہے ۔ ہری بلاس اپنے استعفے میں لکھتا ہے : " جنابِ من ! میرا عقیدہ ہے کہ نظامِ سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے اور اس کے قوانین بھی رحم، حق اور انصاف پر قائم ہیں ۔ میں نے پندرہ سال تک سرکاری خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا .... میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا .... میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمتِ ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا۔ لیکن مراسلہ نمبر ـــــ مورخہ ـــــ میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے خلاف ہیں ۔ اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تعمیل کے لیے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں ۔ ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظامِ حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنا ہے ۔ دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا حق بھی حاصل ہے ۔ اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید

www.taemeernews.com

تاخیر کے اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔"

ہمیں ان کی کہانی کے کردار کے ان لفظوں سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ پریم چند نے اپنے استعفے میں کیا لکھا ہوگا۔ بہر حال پریم چند 16 فروری 1921ء کو اپنی سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لیے سبکدوش ہو گئے۔ پریم چند کو اس استعفے سے جذباتی طور پر کتنی راحت محسوس ہوئی اس کا اندازہ ان کے خط سے ہوتا ہے: "گاؤں جانے کے ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک ماہ کے اندر پاخانہ کے ساتھ آؤں کا آنا بند ہو گیا۔ (اس طرح) غلامی سے نجات پاتے ہی نو سال کے پرانے مرض سے آزاد ہو گیا۔ اس تجربے نے مجھے تقدیر پرست بنا دیا ہے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند سرکاری ملازمت میں زبردست گھٹن محسوس کر رہے تھے اور اس نے ان کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کا علاج محض دواؤں سے ممکن نہ تھا۔ آزادی کی تحریک میں حصہ لے کر ہی اُن کے جذبات کی آسودگی ممکن تھی اور ایسا ہوا بھی۔ ملازمت سے الگ ہوتے ہی وہ آزادی کی تحریک میں پورے جوش و خروش سے شامل ہو گئے۔ عدم تعاون کا پرچار کرنے لگے۔ مہادیو پرشاد پوت دار نے انہیں اس بات کی تحریک کی اور وہ ان کے ساتھ ان کے گاؤں مانی رام چلے گئے۔ دونوں دوستوں پر اب چرخے کا پرچار کرنے کی دھن سوار تھی۔ چرخے بنوانا اور گورکھپور لاکر انہیں بیچنا ان کا کئی دنوں تک مشغلہ رہا۔ زندگی کے اس دور میں پریم چند نے گویا چرخے کا پرچار اور ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کے نصب العین بنا رکھا تھا۔ وہ اس کام میں اتنے مشغول تھے (خاص طور سے چرخے کا پرچار کرنے میں) کہ جب مولوی عبدالحق نے 1921ء میں ان سے مضمون طلب کیا تو پریم چند نے جواب دیا۔ "جامع مضمون لکھنے کے لیے بہت تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت ہے اور میں ترکِ موالات کا پیرو ہونے کے باعث فی الحال اس کے لیے کافی وقت نہیں نکال سکتا۔"

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پریم چند نے اس زمانے میں لکھنا پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ وہ کہانیاں

www.taemeernews.com

بھی لکھتے اور اپنے ناول " گوشۂ عافیت " پر بھی کام کرتے رہے۔ اسی سال (1921) انھوں نے ایک کتابچہ " سوراجیہ کے فائدے " بھی لکھا۔ یہ کتابچہ ہندی میں اُپدیسوگ مالا میں شائع ہوا۔ اس کے چند اقتباسات پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس سے ان کے سوراجیہ کے تصوّر پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے سیاسی خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" اپنے دیش کا پورے کا پورا انتظام جب پرجا کے ہاتھوں میں ہو. تو اُسے سوراجیہ کہتے ہیں۔ جن دیشوں میں سوراجیہ ہے ، وہاں کی پرجا اپنے ہی چُنے ہوئے پنچوں کے ذریعے اپنے اوپر راج کرتی ہے۔ وہاں یہ نہیں ہو سکتا کہ پرجا لگان اور کردوں سے دبی رہے اور ادھیکاری لوگ دنوں دن فوج بڑھاتے جائیں۔ پرجا بھوکوں مر رہی ہو، چاروں اور اکال پڑا ہو اور دیش کا اناج دوسرے دیشوں کو ڈھویا جا رہا ہو. بھوک مری، ہیضہ وغیرہ، بیماریاں پھیل رہی ہوں اور ادھیکاری لوگ اس کو روکنے کا مناسب بندوبست نہ کرتے ہوئے سیر و تفریح میں مشغول ہوں۔ غریب مسافروں کو ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ مل رہی ہو اور ادھیکاریوں کے لیے ایک ایک پوری گاڑی کھڑی رہتی ہو "

سوراجیہ سے متعلق پریم چند کے خیالات بڑے سلجھے ہوئے ہیں اور وہ بہت ہی آسان لفظوں میں اپنی بات پڑھنے والوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

پریم چند نے بعض باتیں سوراجیہ کے اپنے اس کتابچے میں ایسی لکھی ہیں جن سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور سماج رچنا کے پیچیدہ سوالوں پر گہری نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اپنے اس کتابچے میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں :

" سوراجیہ حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ اُن نظاموں کو ترک کرنا ہے جو ہماری

www.taemeernews.com

روح کو دباتے ہیں اور اُسے مفتوح کرتے ہیں۔ عدالتیں، سرکاری نوکریاں، سرکاری تعلیم وغیرہ ہماری روح کو کچلنے والی، ہمارے من کے مقدس جذبات کو دبانے والی، ہمیں کوڑی کا غلام بنانے والی، ہماری وساؤں کو بھڑکانے والی تنظیمیں ہیں۔ ہمارے بچے بچپن سے ہی سرکاری نوکریوں کی آشا کرنے لگتے ہیں، اُسی وقت سے ان کی آتم رکشا (عزتِ نفس) کی طاقت ختم ہونے لگتی ہے، اُنہیں پر کٹے پرندے کی طرح اپنے ڈربے کے سوا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ چاپلوسی کرنے کی اور کائیاں پن کی عادت پڑ جاتی ہے۔"

اُس دور کی عدالتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"عدالتوں کا اثر اس سے کم نقصان دہ نہیں۔ وہاں مقدمہ بازی کرنے والی جنتا اور ان کا دھن لوٹنے والے وکیل مختار دونوں ہی اپنی روح کو کچلتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی جھوٹ، چھل، کپٹ، بے ایمانی کا زبردست ناٹک دیکھنا چاہے، تو اسے ایک بار عدالت میں جانا چاہیے۔ کہیں گواہ تیار کیے جا رہے ہیں، کہیں موکلوں کو ان کا بیان طوطے کی طرح رٹایا جا رہا ہے، کہیں کائیاں محرر موکلوں سے خرچ کے لیے تکرار کر رہا ہے۔ کہیں کرم چاری لوگ رشوت کے سودے چکا رہے ہیں۔ کہیں وکیل صاحب اپنے محنتانے کا سودا پٹانے میں مگن ہیں .... اور یہ سب تماشا کھلم کھلا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہوتا رہتا ہے۔"

آزاد ہندوستان کی عدالتیں بھی اس سے بہتر منظر پیش نہیں کرتیں۔ پریم چند آزاد ہندوستان کا جو تصور رکھتے تھے وہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

"ہم تو صرف اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شلپ اور کلا کی ترقی چاہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ سستا مال بنا کر کمزور ملکوں پر پٹکیں اور تجارت کے بہانے اُن پر اقتدار حاصل کریں۔ اسی تجارتی مقابلے کی وجہ سے یورپ کی قوموں میں ہمیشہ عداوت رہتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہیں۔ اُسی کا نتیجہ یہ جنگِ عظیم (پہلی عالمی جنگ) تھا۔"

منشی پریم چند کا سوراجیہ سے متعلق بڑا ہی صاف ستھرا تصوّر تھا۔ وہ استحصال اور لوٹ مار کے سخت خلاف تھے چاہے اس کی شکل تجارت ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آزاد بھارت کو پونجی واد کے راستے سے بالکل الگ رکھنا چاہتے تھے تاکہ اس ملک کے عوام اور دوسرے پچھڑے ہوئے ترقی پذیر ملکوں کے عوام ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہیں اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ یہی ایک صورت ہے جس سے فن کی ترقی ہو سکتی ہے اور عوام کو کلا کی اس ترقی سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

پریم چند آزاد بھارت میں غریبوں، دلتوں، کسانوں اور مزدوروں کو خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے "زمانہ" کے اکتوبر، نومبر 1921ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

"یہ دھیان میں رکھنا چاہیے کہ مزدور اور کسان ایک ہو کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اُن کی طاقت اَسیم ہے۔ وہ جب تک بکھرے ہوئے ہیں گھاس کے ٹکڑے ہیں۔ ایک ہو کر جہاز کو کھینچنے والی رسّی ہو جائیں گے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ سرمایہ دار پچھتر فیصد منافع بانٹ لیں اور مزدوروں کو زندگی کی ضرورتیں بھی نصیب نہ ہوں۔ وہ ہوا اور روشنی سے بھی محروم رہیں۔ سرمایہ دار تو پیرس اور سوئزرلینڈ کی سیر کریں اور مزدور کو صبح سے شام تک سر اٹھانے کی مہلت نہ ملے۔ زمیندار اور تعلقہ دار صاحب تو عیش منائیں، شکار کھیلیں، دعوتیں دیں اور کسانوں کو روٹیاں بھی نصیب نہ ہوں۔ اس کی

www.taemeernews.com

کمائی ،نذرانے ، بیگار ، ہاری ، ڈانڈ ، کھٹیائی وغیرہ کی صورتوں میں زمیندار کے لیے عیش کا سامان مہیا کریں ۔ بہر حال اِن طبقوں (سرمایہ دار اور زمین دار) سے کانگریس کی مخالفت بہت زیادہ ہے ۔ اور سوراجیہ کی تحریکوں میں روڑے اٹکانا طے شدہ بات ہے"۔

پریم چند کا یہی طبقاتی شعور تھا جس کی وجہ سے وہ گاندھی واد سے بھی غیر مطمئن نظر آتے ہیں. ان کے ان جذبات کا اظہار ان کے ایک مشہور مضمون " مہاجنی تہذیب "، میں ہوا ہے جو انہوں نے 1936ء میں اپنی موت سے تین ہفتے پہلے ہی لکھا تھا ۔ اس مضمون کا تفصیلی ذکر ہم آگے چل کر کریں گے کیونکہ یہ پریم چند کے ذہنی سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند دیسے تحریکِ آزادی کے بڑے گرم جوش سپاہی تھے اور اسی لیے شروع سے ان کی ہمدردی کانگریس کے گرم دَل کے ساتھ رہی تھی ۔ لیکن گرم دَل کے ساتھ بھی یہ ہمدردی اسی وقت تھی جب تک وہ تحریکِ آزادی کے لیے گرم جوشی سے عملی میدان میں کام کرتا تھا ۔ انہیں جب بھی یہ گرم جوشی کم ہوتی نظر آتی وہ گرم دَل کی تنقید کرنے لگتے ۔ چنانچہ 17 فروری 1923ء کے اپنے ایک خط میں دیانرائن نگم کو صاف لفظوں میں لکھتے ہیں : " آپ نے مجھ سے پوچھا میں کس پارٹی میں ہوں ؟ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں ۔ اس لیے کہ دونوں میں کوئی پارٹی (یہاں کانگریس کے نرم اور گرم دَل کی طرف اشارہ ہے) کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے ۔ میں تو اُس آنے والی پارٹی کا ہوں جو قوت الناس (عوام کی طاقت) کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے"۔

منشی جی دھیرے دھیرے کانگریس کی طبقاتی سمجھوتے بازی کی پالیسی سے بیزار ہونے لگے۔ اُن کی ہمدردی صرف ایسی ہی سیاسی جماعت سے ہو سکتی تھی جو ہر طرح سے غریب اور کچلے ہوئے عوام کا بغیر کسی تحفظات کے ساتھ دینے کے لیے تیار ہو ۔ اسی دور میں ہمیں اُن کی تخلیقات جیسے کہ اُن کا ناول "چوگان

www.taemeernews.com

ہستی" یا کہانیوں مثلاً "سوا سیر گیہوں"، "سبھیتا کا رہستیہ" میں ہمیں ایسے کردار نظر آتے ہیں جو ہر طرح سے نادار ہیں اور انقلاب ہی ان کی زندگی کی آخری امید ہے۔ ان کرداروں کے دکھوں سے ہمارا دل دہل جاتا ہے اور ہمیں لوٹ کھسوٹ مچانے والوں سے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ 23 اپریل 1930ء میں لکھے گئے اپنے ایک خط میں نگم صاحب کو لکھتے ہیں: "زر اس کا (سرمایہ دار) ایمان ہے۔ وہ یا تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لیے قیمت نہ دے کر دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے یا وہ اس خیال میں مگن ہے کہ آپ ہی آپ آزادی مل جائے گی۔ کانگریس کے دورِ اوّل میں وہ خائف رہا، کانگریس کے دورِ ثانی میں بھی اس کی یہی حالت رہی۔ وہ صریح طور پر دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ ملا اور جسے وہ اپنا حق سمجھتا ہے، وہ دوسروں کے ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے، پھر وہ ایثار و قربانی میں شریک نہیں ہوتا۔ یہی بورژوا فضا ہے اور یہی نادار فرقے کو دار فرقے کا دشمن بنا دیتا ہے۔"

اس خط کے چند ہفتوں پہلے ہی انہوں نے اپنے رسالے "ہنس" کے 10 مارچ 1930ء کے شمارے میں اپنا اداریہ قلمبند کرتے ہوئے لکھا تھا:

"نیشنلسٹ پارٹی (کانگریس کے ان لیڈروں کی طرف اشارہ ہے جو ڈومینین کے حق میں تھے) کو غور سے دیکھیے تو اس میں ہمارے راجے مہاراجے، ہمارے زمیندار، ہمارے دھنی مانی بھائی ہی زیادہ نظر آتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سوراجیہ کی دَشا (حالت) میں انہیں کچھ دب کر رہنا پڑے گا، سوراجیہ میں مزدوروں اور کسانوں کی آواز اتنی کمزور نہ رہے گی۔ کیا یہ لوگ اس آواز کے ڈر سے تھرتھرا رہے ہیں؟ ہمیں تو ایسا ہی جان پڑتا ہے۔ وہ اپنے دل میں سمجھ رہے ہیں کہ اُن کے مفادات کی حفاظت انگریزوں ہی سے ہو سکتی ہے۔ سوراجیہ کبھی انہیں غریبوں کو کچلنے اور ان کا خون چوسنے نہ دے گا.... سوراجیہ غریبوں کی آواز ہے،

www.taemeernews.com

ڈومینین غریبوں کی کمائی پر موٹے ہونے والوں کی نہیں "

کتنا صاف ذہن تھا اُن کا سوراجیہ کے متعلق ! لیکن منشی جی کے تصوّر کا سوراجیہ جو "غریبوں کی آواز" ہے، آج بھی قائم نہیں ہو سکا ہے۔ آج بھی غریبوں کا خون چوسنے والے اور ان کی کمائی پر موٹے ہونے والے پونجی پتی ہمارے دیش پر حاوی ہیں۔ پریم چند اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اسی اداریے میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

"اُن کے (راجے مہاراجے، زمیندار اور سرمایہ دار) سوراجیہ میں غریبوں کا، مزدوروں کا، کسانوں کے لیے جگہ نہیں ہے، جگہ ہے صرف اپنے لیے۔ لیکن جس آدمی کے دل میں غریبوں کی دن بدن گرتی ہوئی حالت دیکھ کر شعلہ سا اٹھتا ہے، جو اُن کا خاموش درد دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا ہے، وہ کسی ایسے سوراجیہ کے تصوّر سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جس میں کچھ اونچے درجے کے آدمیوں کا مفاد ہو اور عوام کی حالت جیوں کی تیوں بنی رہے۔ ہماری لڑائی صرف انگریز حکمرانوں سے نہیں، ہندوستانی حکمرانوں سے بھی ہے۔ ہمیں ایسے آثار نظر آ رہے ہیں کہ یہ دونوں حکمراں طبقے اس اُدھار بک لڑائی میں آپس میں مل جائیں گے اور عوام کو دبانے کی، اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کریں گے "

پریم چند کی دور بیں نگاہوں نے سیاسی صورتِ حال کا کتنا صحیح تجزیہ کر لیا تھا۔ وہ تحریکِ آزادی کے لیے لڑنے والوں کے طبقاتی کردار سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اس کا بالکل صحیح شعور رکھتے تھے کہ یہ کہاں اور کس موقع پر اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ پریم چند کے تصوّر کا سوراجیہ آج بھی ہم قائم نہیں کر سکے ہیں، آج بھی عوام کی اور خصوصاً محنت کش عوام کی حالت بہت بُری ہے "ہنس" میں پریم چند عوام کے مسائل کو لے کر بڑے زوردار اداریے

www.taemeernews.com

قلم بند کرتے رہتے تھے۔ "ہنس" ہی کے ایک اداریے میں لکھتے ہیں :

"کانگریس کے ممبر یا اور لوگ بھی کبھی کبھی انصاف اور اصول کے ناتے بھلے ہی کسانوں کی وکالت کریں، لیکن کسانوں کے طرح طرح کے دکھوں اور مصیبتوں کا انہیں وہ احساس نہیں ہو سکتا، جو ایک کسان کو ہو سکتا ہے۔ سب چھوٹے بڑے اسی کو نوچتے ہیں، سب اسی کا خون اور گوشت کھا کھا کر موٹے ہوتے ہیں، پر کوئی اس کی خبر نہیں لیتا.... ان کی (کسانوں کی) طاقت بکھری ہوئی ہے۔ اگر انہیں منظم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو سرکار، زمیندار، سرکاری ملازم اور مہاجن سبھی بھنا اٹھتے ہیں، چاروں اور سے ہائے ہائے مچ جاتی ہے، بالشوزم[1] کا ہوا بنا کر اس تحریک کو جڑ سے کھود کر پھینک دیا جاتا ہے۔"

کیا یہی بات ٹھیک آج بھی ہمارے دیش میں نہیں ہو رہی ہے؟ کیا بے زمین کسانوں کو بڑے بڑے زمیندار اور مہاجن آج بھی لوٹ نہیں رہے ہیں؟ کیا آج بھی ان کسانوں کے آندولن کو کچلنے کی سازش نہیں ہو رہی ہے؟ پریم چند نے نہ صرف اپنے اداریوں بلکہ "میدانِ عمل" اور "گئودان" جیسے ناولوں کے ذریعے بھی کسانوں کی قابلِ رحم حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ "ہنس" میں منشی جی جو کچھ لکھ رہے تھے وہ انگریز سرکار کی برداشت سے باہر تھا۔ جولائی 1930ء میں جب "ہنس" کا چوتھا شمارہ شائع ہو چکا تھا اور پانچواں شمارہ پریس میں تھا، سرکار نے پریس سے ایک ہزار روپے کی ضمانت مانگی، تو پریم چند نے اُس شمارے کو کسی اور پریس میں چھپوانے کی کوشش کی۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، ایسے انقلابی خیالات کے پرچار کرنے والے پرچے کو چھاپنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ آخر

---

[1] ۔ روس کی بالیشوک یعنی کہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف اشارہ ہے۔

www.taemeernews.com

مجبور ہو کر رسالے کو بند کر دینا پڑا۔

لیکن پریم چند کہاں خاموش بیٹھنے والے تھے۔ اُن کے سینے میں آزادی اور انصاف کے لیے جو تڑپ تھی وہ انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ونود شنکر ویاس نے ایک پندرہ روزہ "جاگرن" نکالنا شروع کیا تھا۔ ونود شنکر اسے چلا نہیں سکے اور اس کے خریداروں کا حلقہ دو سو سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ پریم چند نے اس ذمے داری کو سنبھالا اور اب اسے ہفتہ وار کی شکل میں نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے جینندر کو لکھا: "تمہارا ارادہ بھی ایک ہفتہ وار رسالہ نکالنے کا تھا۔ یہ تمہارے لیے ہی سامان ہے۔ میں جب تک اسے چلاتا ہوں پھر یہ تمہاری چیز ہے۔ پیسے کی کمی ہے۔ "ہنس" میں کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں۔ لیکن ہفتہ وار نکالنے کی لالچ کو نہ روک سکا۔" "جاگرن" کا پریم چند کی ادارت میں پہلا شمارہ 22 اگست 1932ء میں شائع ہوا۔ "جاگرن کا نیا روپ"، عنوان کے تحت انہوں نے لکھا:

"'جاگرن' نے ادبی رسالہ کی شکل میں جنم لیا تھا۔ اپنے بچپن کے 12 شمارے پورے کر کے اب وہ ایک وسیع حلقے میں آگیا ہے، اس کا جنم اچھے گھرانے میں ہوا۔ اس کی پرورش قابل ہاتھوں میں ہوئی، پرکھنے والے پرکھ گئے کہ یہ بالک ہونہار ہے پر ادب کے محدود دائرے میں اس کی ترقی جتنی ہونی چاہیئے تھی ویسی نہ ہو سکتی تھی۔ ہاتھ پاؤں مارنے والا بالک پالنے میں کب تک رہتا۔ اس لیے اس کے جنم دینے والوں کو ایسے ابھیواوک کی ضرورت پڑی جو ذرا سخت ہاتھوں سے اس کی گوشمالی کر دیا کریں جو ممتا بھرے ماکھن اور مصری کی جگہ سوکھے چنے اور روکھی روٹیاں کھلائے۔ کیونکہ سنسار میں پہلے چاہے لاڈ پیار میں پلے بالکوں کو پڑھنے کا موقع ملتا رہا ہو اب تو وقت ان کے موافق نہیں رہا۔ آج سنسار میں وہی بالک بازی لے جاتا ہے جس نے

www.taemeernews.com

بچپن میں کڑیاں جھیلیں ہوں، دھکے کھائے ہوں بھوکے سوئے ہوں، جاڑوں میں ٹھٹھرے ہوں گملے کا پودا دھوپ اور بارش کا سامنا کیا کرے گا، وہ چٹان پر اگا ہوا پودا ہی ہے جو جیٹھ کی چلتی لو، ماگھ کی سخت سردی اور بھادوں کی موسلا دھار بارش میں ڈٹا کھڑا رہتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ ہمارے اوپر انتخاب کی نگاہ پڑی۔ ہم کہہ نہیں سکتے کہ ہم کیوں اس کام کے لیے چنے گئے۔ ہم اس کام کے بہت عادی نہیں ہیں۔ ابھی تک ایک چڑیا پالی ہے اور اسے بھی کئی بار مشکل میں ڈال چکے ہیں۔ شکاریوں کے دو نشانے اس پر لگ چکے ہیں۔"

پریم چند کے لیے "جاگرن" کو سنبھالنا اتنا آسان نہ تھا۔ ان پر کافی مالی بوجھ پڑا۔ دو مہینے بھی نہ بیتے تھے کہ اپنے دوست نگم کو لکھا۔" جاگرن "ہفتہ وار میں خوب چپت پڑ رہی ہے پر ہمت کیے نکالے جاتا ہوں۔ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔" دراصل پریم چند یہ نقصان اسی لیے برداشت کر رہے تھے کہ وہ اپنے سیاسی خیالات کا کسی نہ کسی طرح پرچار کر سکیں۔ "ہنس" کا اکتوبر، نومبر میں سودیش نمبر نکالا۔ اس شمارے میں انہوں نے ایک مضمون " نوٹیگ" کے عنوان سے لکھا۔ اُس میں لکھتے ہیں :

" جہاں حکومت کے خلاف زبان کھولنا بڑے سے بڑا جرم ہے۔ جس کی سزا موت ہے، وہاں امن کے خیالات کو طاقت سے کچل کر بہت دن تک امن کی حفاظت نہیں کی جا سکتی.... مذہبی اداروں نے حکمرانوں سے اس طرح اپنے کو ملا رکھا ہے اور جمہوریت کی اتنی مخالفت کی تھی اور کر رہے ہیں کہ جتنا اب آزادی کی نئی امنگ میں مذہبی انجمنوں کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ روس اور اسپین دونوں ہی ملکوں کی یہی حالت ہے۔ ہندوستان میں کچھ وہی ہوا چلتی نظر آتی ہے۔"

www.taemeernews.com

"ہنس" میں 'انت' نامی کہانی کی اشاعت پر سرکار نے پھر دو ہزار کی ضمانت طلب کرلی۔ پریم چند کی حالت بڑی خراب تھی۔ انہوں نے اپنے خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے جینندر کو لکھا: "بہت پریشان ہوا، بھاگا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ وہاں چیف سکریٹری سے مل کر کہانی کا مقصد سمجھایا اور اپنی لائلٹی کے ثبوت دیے۔ اب امید ہے کہ ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔ ذرا سی بات میں گردن پر چھری چل جاتی ہے۔"

ان زیادتیوں کے باوجود پریم چند صحافت کے میدان میں ڈٹے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً انہیں زک ہوتی تھی اور پیچھے بھی ہٹنا پڑتا تھا لیکن میدان انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی صورت نکال کر مضامین لکھتے رہتے تھے تاکہ عوام میں قومی آزادی اور سماجی انصاف کے جذبات پیدا کر سکیں اور انگریز حکمرانوں کی غلامی سے ہندوستان کی گلو خلاصی ہو۔

www.taemeernews.com

7

پریم چند زندگی بھر فرقہ واریت کی لعنت کے خلاف لڑتے رہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس سلسلے میں ان کے خیالات پر کچھ روشنی ڈالیں۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست عناصر ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیتے تھے اور دیش کی آزادی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے رہتے تھے۔ دراصل یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ فرقہ واریت کی بنیاد مذہب ہے۔ یہ پڑھ کر کچھ لوگوں کو تعجب ہوگا کیونکہ فرقہ پرست طاقتیں ہمیشہ مذہب کی دہائی دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم میں سے اکثر لوگ ایسا سمجھنے لگے ہیں کہ مذہب ہی ہمیں آپس میں لڑاتا ہے۔ کئی لوگ تو یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر فرقہ واریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے تو ہمیں مذہب کو مٹانا ہوگا۔ لیکن جو لوگ سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقہ واریت کی اصل جڑ مذہب نہیں، وہ مفادات ہیں جن کا سیاسی اور معاشی تبدیلی سے نقصان ہوتا ہے۔ یہ مفاد پرست عناصر کسی طرح بھی ایک مبنی بر انصاف معاشرہ قائم کرنے دینا نہیں چاہتے۔ وہ تمام ایسی سیکولر طاقتوں کی زبردست مخالفت کرتے ہیں جو ایک سیکولر جمہوری نظام قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ ایسے عناصر بچھڑے ہوئے عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرکے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ ان مفاد پرست عناصر کے لیے مذہب محض ایک آلۂ کار

www.taemeernews.com

ہے اور وہ مذہب کو آلۂ بنا کر اپنے مفادات کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں - ہم جب تک فرقہ واریت کے اصلی روپ کو نہیں پہچانیں گے اس کا ٹھیک طور سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتے - فرقہ واریت کی لعنت آج بھی ہمارے جمہوری اور سیکولر معاشرے کے لیے ایک زبردست خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بھی اس نے بڑا منفی رول ادا کیا۔

جب بھی عوامی تحریک آزادی کے لیے یا مبنی بر انصاف معاشرہ قائم کرنے کے لیے زور پکڑتی ہے - فرقہ پرست طاقتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور بغلیں جھانکنے لگتی ہیں - لیکن جب بھی عوامی تحریک کمزور ہوتی ہے فرقہ پرست طاقتیں آگے آکر عوام میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ مذہب کی آڑ میں اُن کے مفادات پر کوئی چوٹ نہ پڑے - عدم تعاون اور ترکِ موالات کی تحریک جب زوروں پر تھی، اور عوام پورے جوش و خروش سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے - فرقہ پرست لیڈر بغلیں جھانک رہے تھے - ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ان کی متحدہ طاقت کو توڑ سکیں - لیکن ترکِ موالات کی یہ تحریک 1922ء میں چوری چورا واقعے کے بعد جب واپس لے لی گئی تو فرقہ پرستی نے زور پکڑا اور دونوں طرف سے مفاد پرست عناصر نے شدھی اور تبلیغ کے چولے پہن کر ہندو اور مسلم عوام کو آپس میں لڑانا شروع کر دیا - ملک کی فضا مسموم ہو گئی اور آزادی کے جیالوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا -

پریم چند آزادی کے متوالے تھے اور ہندوستان کو جلد سے جلد انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے - ظاہر ہے ان کے لیے فرقہ پرستی ایک ناقابلِ برداشت لعنت تھی اور وہ ہندوستانی معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنا چاہتے تھے تاکہ عوام کی طاقت کمزور نہ ہونے پائے - انہوں نے ہر طرح سے فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کیا اور اس سلسلے میں مضامین بھی لکھے - ہم نے اوپر ان کے چند اقتباسات ان کا سوراجیہ کا تصور واضح کرنے کے لیے پیش کیے ہیں - وہ آزاد ہندوستان

www.taemeernews.com

کا ایسا تصور رکھتے تھے جو ہر طرح کی ناانصافیوں اور لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو۔ ایسا شخص فرقہ پرستی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ فرقہ پرستی کی جڑیں ایسے ہی معاشرے میں پھیلتی ہیں جہاں نابرابری ہو، اونچ نیچ ہو، ناانصافی اور مفاد پرستی ہو۔ پریم چند ان تمام باتوں کے سخت خلاف تھے اور فرقہ پرستی کی جڑوں کو ہمارے معاشرے سے اُکھاڑے بغیر ان تمام لعنتوں سے بھی کیسے نجات مل سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کا ذہنی اور تہذیبی پس منظر بھی ایسا تھا جس میں فرقہ پرستی کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے جو ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی روایتوں کا علمبردار تھا۔ ان کی تعلیم بھی شروع سے اردو فارسی زبان میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ایک مسلم مولوی کے ہاتھوں حاصل کی۔ دیہاتوں میں ویسے بھی فرقہ پرستی کی لعنت نہیں پائی جاتی۔ اس کی جڑیں شہری علاقوں میں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں اور پریم چند کا تعلق ایک چھوٹے سے دیہات سے تھا۔ وہ بچپن سے ہی فرقہ واریت کی مسموم فضا سے دور رہے۔ قمر رئیس اپنے مضمون "پریم چند اور فرقہ واریت" میں لکھتے ہیں:

> "پریم چند بھی اسی روشن طبع جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور کم و بیش اسی تاریخی شعور اور وسعتِ ذہنی کے ساتھ انہوں نے ہندوستانی عوام کی معاشرت اور تہذیب کو دریافت کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ سوامی وویکانند اور آریہ سماجی رہنماؤں کے خیالات سے بھی متاثر رہے اور اس عہد کی بعض کہانیوں اور ناولوں میں ان خیالات کی اشاعت بھی کی۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پریم چند نے یہاں بھی غیر ملکی حکومت کے چنگل سے آزادی اور بیوگی اور چھوت چھات کے خلاف احتجاجی خیالات پر زور دیا ہے۔ دوسرے احیاء پسندانہ خیالات سے انہوں نے بہت کم تعلق رکھا اور صرف چند برس بعد احیاء پرستی کو قدامت پرستی اور فیوڈل طرزِ فکر کی

www.taemeernews.com

نقاب سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔"

فرقہ واریت کے سلسلے میں قمر رئیس نے بڑی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آریہ سماج فرقہ پرستی کے معاملے میں بے داغ نہیں رہی ہے اور چونکہ پریم چند، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، آریہ سماج تحریک کے بڑے حامی تھے بعض لوگوں کو پریم چند کی طرف سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ پریم چند آریہ سماج کی سماجی اصلاح پسندی کے دلدادہ تھے۔ جہاں آریہ سماج نے ویدوں پر زور دے کر احیا پرستی کو جلادی وہاں اس نے ہندو سماج کی برائیوں کی کڑی نکتہ چینی بھی کی۔ پریم چند خود سماجی اصلاح کے علمبردار تھے اور ان کے اسی ذہنی رجحان نے انہیں آریہ سماج کی طرف کھینچا اور انہوں نے اپنے مضامین اور تخلیقی ادب کے ذریعے سماجی اصلاحات کا خوب پرچار کیا۔ لیکن انہوں نے آریہ سماج کی احیا پرستی اور بعض حالات میں فرقہ پرستی کی کبھی حمایت نہیں کی، اس کے برخلاف جب بھی کسی آریہ سماج کے کسی رکن نے فرقہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کی تو پریم چند نے ہر ممکنہ طریقے سے اس کا مقابلہ کیا۔ جب آریہ سماجیوں نے 1923ء میں بڑے پیمانے پر شدھی تحریک شروع کی تو پریم چند نے اس کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ 23 اپریل 1923ء کے اپنے خط میں دیانرائن نگم کو اس تحریک سے متعلق یوں لکھا: "شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین، چار دن میں بھیجوں گا۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اس مضمون کو "زمانہ" میں جگہ دیں گے۔" جس مضمون کا اس خط میں ذکر ہے وہ "قحط الرجال" کے عنوان سے "زمانہ" کے فروری 1924ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے شدھی تحریک کی بھی نکتہ چینی کی اور اُن رہنماؤں کی بھی جو اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس نے بھی اجتماعی طور پر اس تحریک سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود انفرادی طور پر اس میں شامل ہونے میں کچھ بھی اٹھا نہیں رکھا۔ اتنا ہی نہیں ایک بھی ذمے دار کانگریسی نیتا نے اعلان

www.taemeernews.com

کر کے ان تحریکوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔"

اسی طرح 1933ء میں چترسین شاستری کی کتاب "اسلام کا وش ورکش" (اسلام کا زہریلا درخت) شائع ہوئی تو پریم چند تڑپ اُٹھے۔ اس کتاب کا مقصد دینِ اسلام پر کیچڑ اُچھال کر فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنا تھا اور ایسی بات پریم چند کب برداشت کر سکتے تھے۔ جنندر کمار کو اسی سلسلے میں ایک خط میں لکھا: "ان چترسین کو کیا ہو گیا ہے کہ اسلام کا وِش ورکش لکھ ڈالا۔ اس کی ایک تنقید تم لکھو اور وہ کتاب میرے پاس بھیجو۔ اس کمیونل پروپیگنڈے کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔" ہندی کے مشہور ادیب بنارسی داس چترویدی کی بھی اس کتاب کے خلاف لکھنے کے لیے ہمت افزائی کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا:

> "فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ نہایت شرانگیز اور سستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں لکھوں گا اور اب جب کہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور ہیں لیکن ہمیں اس کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ ہمارا مقصد مقدس ہے۔ میں آپ کا نوٹ "جاگرن" میں شائع کر رہا ہوں۔"

پریم چند نے اپنے ہندی رسالوں "ہنس" اور "جاگرن" میں اس کتاب کے خلاف پرزور احتجاج کیا جس کے نتیجے میں ایک بڑا حلقہ ان کے خلاف ہو گیا اور بعض لوگوں نے تو انہیں مارنے کی بھی دھمکی دی۔ اس پر انہوں نے اپنی بیوی شیورانی دیوی سے کہا کہ اگر ہم ادیب ان دھمکیوں سے ڈر جائیں تو دنیا کو اپنے خیالات دے چکے۔ اپنے ہندی رسالوں میں چترسین کی کتاب کی کڑی نکتہ چینی کرنا بڑے دِل گردے کا کام تھا اور پریم چند نے اسے پوری ہمت سے کیا۔ انہیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یک جہتی بے حد عزیز تھی اور اس مقصد کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے

www.taemeernews.com

کے لیے تیار تھے۔

پریم چند فرقہ واریت کے اصلی روپ سے بھی خوب آگاہ تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ہندی مضمون "فرقہ واریت اور تہذیب" میں یوں رقمطراز ہیں:

"فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے۔ اُسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شاید شرم آتی ہے۔ اس لیے وہ (اس) گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جماتا پھرتا ہے۔ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے، نہ ہندو تہذیب، نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب۔ مگر ہم آج بھی ہندو اور مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں حالانکہ تہذیب کا دھرم سے کوئی تعلق نہیں۔ آریہ تہذیب ہے، ایرانی تہذیب ہے، عرب تہذیب ہے۔ لیکن عیسائی تہذیب اور مسلم یا ہندو تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

پریم چند نے یہاں ایک بڑی ہی بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تہذیب ایک بہت ہی پیچیدہ سماجی اور اقتصادی عمل ہے اور مادی عوامل کسی بھی تہذیب کے بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ اس کا رشتہ صرف مذہب سے جوڑنا غلط ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کا مذہب اور ہندی مسلمانوں کا مذہب ایک ہونے کے باوجود عرب تہذیب اور ہندی مسلمانوں کی تہذیب میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ یہی فرق انڈونیشیا اور ایران کے مسلمانوں کی تہذیب میں بھی ہے۔ اگر مذہب ہی تہذیب کی بنیاد ہوتا تو ساری دنیا کے مسلمانوں اور دوسری طرف تمام عیسائیوں کی تہذیب ایک ہی ہوتی۔ لیکن ہم اچھی طرح

www.taemeernews.com

جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے ۔ مذہب ایک ہونے کے باوجود بھی الگ الگ ملکوں اور الگ الگ علاقوں کی تہذیبیں الگ الگ ہیں کیونکہ تہذیبوں کو بنانے میں مادّی عوامل کام کرتے ہیں ۔ اس لیے اگر فرقہ پرست تہذیب کا سہارا لیتے ہیں تو محض اپنا اصلی روپ چھپانے کے لیے کیونکہ فرقہ پرستی کا اصل چہرہ بڑا ہی گھناؤنا ہے ۔ اس کی اصلیت اوپری طبقوں کی مفاد پرستی ہے اور سماج میں بنیادی یا انقلابی تبدیلی کے عمل کو روکنے کے لیے یہ مفادات مذہب، تہذیب وغیرہ جیسی باتوں کو اپنا سہارا بنانا چاہتے ہیں ۔ پریم چند نے اپنے مندرجہ بالا مضمون میں فرقہ پرستی کی اسی اصلیت کو بے نقاب کیا ہے ۔

بعض لوگوں نے پریم چند کی اِدھر اُدھر لکھی ہوئی چند باتوں کو بنیاد بنا کر اُن پر ہندو فرقہ پرست ہونے کا الزام لگایا ہے ۔ مثلاً انہوں نے 1912ء کے اپنے ایک خط میں اردو ہفتہ وار کے سلسلے میں لکھا تھا ۔ "آپ کا ہفتہ وار 'کامریڈ' کے نمونے کا ہونا چاہیے مگر پالیسی ہندو ۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا اور اس کی کوشش فضول ہے ۔" انسان اپنے ذہنی ارتقاء میں مختلف ادوار سے گذرتا ہے ۔ پریم چند بھی یقیناً ان مرحلوں سے گذرے ہیں ۔ اور اس سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے کہ انسان پر مختلف موڈ طاری ہوتے ہیں ۔ یہ خط 1912ء کا لکھا ہوا ہے ۔ اور چونکہ دوسرے خطوط یا تحریروں میں ان کے یہاں اس قسم کی باتیں عام طور پر نہیں پائی جاتیں ہم اس سے یہی نتیجہ نکالیں گے کہ ایک خاص ذہنی کیفیت کے تحت پریم چند نے یہ بات لکھدی ہے جو بنیادی طور پر اُن کے مزاج سے میل نہیں کھاتی ۔ اس کے ایک گذراں ذہنی کیفیت ہونے کے ہی امکانات زیادہ ہیں کیونکہ اسی دور میں ان کی تحریروں سے اس قسم کے کئی اور ثبوت مہیا نہیں کیے جا سکتے ۔ وہ اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ذہنی اور جذباتی طور پر فرقہ پرست کبھی نہیں رہے ۔ اُن کے دوست دیا نرائن نگم نے بھی اس سلسلے میں گواہی دی ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمان دونوں سے نالاں رہتے

www.taemeernews.com

تھے اور تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔"

پریم چند خود ہندو فرقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن جہاں انہیں مسلمانوں کی طرف ہندوؤں کے رویے میں زیادتی نظر آتی تھی وہ بڑی بے باکی سے اس کی مذمت کرتے تھے۔ وہ اس معاملے میں ی، آر داس سے زیادہ قریب تھے۔ اپنے مضمون "قحط الرجال" جو فروری 1924ء میں "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا، میں پریم چند نے لکھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں ہندوؤں کا رجحان الزام سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات پر بھی انہیں افسوس تھا کہ ہندوؤں نے خلافت تحریک کے مقاصد کو نہ اچھی طرح سے سمجھا نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے اسے ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور گاندھی جی کی نظر سے نہیں۔ پریم چند یہ بھی سمجھتے تھے کہ مولانا محمد علی اور شوکت علی اور سیف الدین کچلو ہندو مسلم اتحاد کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ انہوں نے سوراج اور اس اتحاد کو ہمیشہ ہم معنیٰ سمجھا ہے۔ اسی لیے پریم چند نے محمد علی، شوکت علی کی جوڑی کو رام اور لچھمن کی جوڑی سے تشبیہ دی۔ ایک ہندو بھلا اس سے زیادہ کسی کو کیا خراجِ عقیدت پیش کر سکتا تھا۔ ہمیں یہاں محمد علی کے خیالات یا بعد کے سیاسی رویے سے بحث نہیں ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ پریم چند کا ذہن فرقہ واریت کے مسئلے پر کتنا صاف تھا اور ہندو مسلم اتحاد کو وہ کتنی اہمیت دیتے تھے۔ شدھی تحریک کے پریم چند اتنے شدید مخالف تھے کہ اس معاملے میں وہ بڑے سے بڑے لیڈروں کی بھی کڑی نکتہ چینی کرتے نہ تھکتے تھے۔

ستمبر 1924ء میں پریم چند لکھنؤ میں تھے اور اسی دوران وہاں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ اپنے 30 ستمبر 1924ء کے خط میں اس کے متعلق دیا نرائن نگم کو لکھا۔ ہندو مسلم فساد اب بھی ہو رہے ہیں۔ میں نے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی اور جو کچھ میں نے کہا تھا وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہا

www.taemeernews.com

ہے ۔ ہندو سبھا دہلی میں سمجھوتے کی راہ میں روڑے اٹکا سکتی ہے ۔ لکھنؤ میں ہندوؤں نے فرقہ دارانہ فسادات کو ہوا دی اور انہوں نے زیادتیاں بھی کیں اور یہ سب کر کے موقع واردات سے غائب ہو گئے۔[1]

پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی تخلیقات کا بھی موضوع بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھیں اور آپس کی غلط فہمیاں دور ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک بہت ہی اہم اور جذباتی واقعے کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا۔ انہوں نے کربلا پر ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ نومبر 1924ء میں گنگا پستک مالا کی طرف سے شائع ہوا۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام کا زبردست المیہ تصور کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو حضرت امام حسینؓ سے بڑی عقیدت ہے۔ اس ڈرامے میں امام حسینؓ اور ان کے اعزا اور رفقا کی حق کی خاطر لڑائی اور عظیم قربانی کو تمثیلی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ 5 ایکٹ اور 43 سینوں کے اس ڈرامے میں پریم چند نے ساہس راؤ کا ایک ہندو کیریکٹر بھی شامل کر لیا ہے۔ جب امام کربلا کے میدان میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں ساہس راؤ کی سربراہی میں ہندوؤں کا ایک قافلہ وہاں سے گذرتا ہے۔ جب ساہس راؤ اور اس کے ساتھیوں کو علم ہوا کہ حضرت امام حسینؓ حق و انصاف کی خاطر جنگ کر رہے ہیں تو وہ بھی امام کی حمایت میں اس جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مشکوک سہی لیکن یہاں پریم چند کا مقصد ہندو مسلم اتحاد پر زور دینا تھا۔ تاریخی تحقیق کا کام کرنا نہیں۔ کچھ مسلمانوں نے پریم چند کے اس ڈرامے پر تاریخی صحت کے اعتبار سے اعتراض بھی کیے لیکن پریم چند نے اپنے نیک مشن کے

---

[1] یہاں ہم نے مدن گوپال کی انگریزی کتاب "منشی پریم چند۔ اے لٹریری بایوگرافی" سے خط کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

www.taemeernews.com

پیشِ نظران اختلافات کی پرواہ نہیں کی ۔

پریم چند نے کربلا کے ڈرامے کے علاوہ اور بھی کئی کہانیاں ایسی لکھیں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ ہندو مسلم ایکتا پر زور دیتی ہیں یا مذہبِ اسلام کی صحیح اسپرٹ کو ہندوؤں کے سامنے پیش کرتی ہیں ۔ "نیا یے" (انصاف) پیغمبر اسلام کی زندگی کے ایک واقعے پر مبنی ہے اور آپ کی انصاف پسندی پر زور دیتی ہے ۔ اسی طرح "راجہ بھگت" راجہ بخت اور سنگھ کی کہانی ہے جو لکھنؤ کے نوابوں سے برطانوی سرکار کے مقابلے میں اپنی وفاداری جتاتا ہے اور اس کی سازشوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ چھما (معافی) ہسپانوی عرب سردار کی کہانی ہے جس کے بیٹے کو ایک عیسائی قتل کر دیتا ہے ۔ لیکن حالات کی مجبوری اسے اسی عرب سردار کے یہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے بیٹے کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ لیکن عرب شیخ ایک بار اُسے پناہ دینے کا وعدہ کر کے یہ جاننے کے بعد بھی کہ وہ اس کے بیٹے کا قاتل ہے اپنا وعدہ نبھاتا ہے اور اُس عیسائی کی حفاظت کرتا ہے ۔" مندر اور مسجد " ایک مسلم زمیندار کی کہانی ہے جو ہندو دھرم کا بھی اتنا ہی احترام کرتا ہے جتنا اسلام کا ۔ کچھ تنگ نظر مسلمان اس مسلم زمیندار چودھری عشرت علی سے نفرت کرتے ہیں اور جنم اشٹمی کے مقدس تہوار کے دن ایک ہندو مندر پر حملہ کر دیتے ہیں ۔ چودھری عشرت علی اپنے ایک وفادار راجپوت ملازم بھجن سنگھ کو ان مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجتا ہے ۔ بھجن سنگھ کے ہاتھوں ان حملہ آوروں میں عشرت علی کا داماد اور وارث بھی مارا جاتا ہے ۔ بھجن سنگھ گھبرا کر خودکشی کر لینا چاہتا ہے ۔ مگر عشرت علی اُسے مرنے سے بچاتا ہے اور کہتا ہے کہ مندر پر حملہ کرنے والے اور ہندوؤں کے مقدس مقام کی بے حُرمتی کرنے والے کو یہی سزا ملنا چاہیے تھی ۔ قانون کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے عشرت علی بھجن سنگھ کو پناہ دیتا ہے اور جب بھجن سنگھ کو اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے تو عشرت علی تنگ نظر مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود بھجن سنگھ کا دفاع کرتا ہے ۔ جب بھجن سنگھ چھوٹ کر آتا ہے تو ہندو فرقہ پرست اُسے اپنا ہیرو بناتے ہیں اور مسلمانوں

www.taemeernews.com

سے بدلہ لینے کے لیے دوسرے جنم اشٹمی کے تہوار پر مسجد پر حملہ کر کے مسلمانوں کو زدوکوب کرتے ہیں عشرت علی جس نے بھجن سنگھ کو بچانے کے لیے اتنا کچھ کیا تھا اور اپنے داماد کا خون بھی معاف کر دیا تھا۔ بھجن سنگھ کی اس حرکت کو دیکھ کر سخت ملول ہوتے ہیں اور اُسے مار ڈالنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ بھجن سنگھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے مالک سے کہتا ہے کہ آپ ہی نے میری جان بچائی تھی اور یقیناً آپ کو میری زندگی پر پورا اختیار ہے۔ کل آپ کسی کو بھیج کر میرا سر منگالیں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میرے ہی گھر میں مجھے کس نے قتل کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی تخلیقات کے ذریعے بھی پریم چند نے تمام تعصبات سے بلند ہو کر ہندو مسلم اتحاد کا پرچار کیا۔ اس کے باوجود بعض تنگ نظر لوگ ان پر طرح طرح کے الزام عائد کرتے نہیں تھکتے۔ کچھ لوگوں نے ان پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ وہ مسلم کرداروں کو ہندو کرداروں کے مقابلے میں مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر پریم چند کی تخلیقات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل سطحی اور بیجا معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ راج بہادر گوڑ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کبھی کبھی کچھ لوگ بددیانتی سے پریم چند پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کی ادبی تخلیقات میں پولیس انسپکٹر، داروغہ وغیرہ جیسے 'ظالم' کردار اکثر مسلمان ہوتے ہیں اور اسے وہ پریم چند کی 'فرقہ پرستانہ ذہنیت' سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن حافظ محمد عبداللہ نے بھی تو رابرٹ اسمتھ اور ولیم لیمب کی ایما پر ایک ڈراما "ناٹک پولیس ڈرامہ" لکھا تھا جہاں بنیا ہے "دھن داس"، پولیس سب انسپکٹر ہے "رشوت بیگ" اور ہیڈ کانسٹبل ہے "زبردست خاں"۔ اس ڈرامے کا مقصد یہ تھا کہ پولیس کو غیرت دلائی جائے.... اور اس مسلمان ڈرامہ نگار نے بھی تو پولیس سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹبل کو مسلمان دکھایا ہے۔ کیا یہ بھی فرقہ وارانہ تنگ نظری ہے؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنے ایک مضمون میں اس اعتراض کو غلط بتایا ہے کیونکہ اس زمانے میں ان عہدوں پر مسلمان ہوتے بھی تھے اور پریم چند نے

www.taemeernews.com

زندگی ہی سے کیریکٹر لیے ہیں۔

یہ اعتراض اور بھی بالکل لچر معلوم ہونے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی کئی کہانیوں میں پریم چند نے مسلم کرداروں کو اعلےٰ اخلاقی نمونوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ "مندر اور مسجد" میں چودھری عشرت علی کا کردار ہی اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اپنے ناول "گئودان" میں مرزا کا کردار بھی پریم چند نے کچھ انسانی کمزوریوں کے باوجود بڑی ہمدردی سے اُبھارا ہے۔ چنانچہ جب مرزا کے ایک وکیل دوست مسٹر ٹنخا انہیں دولت کا لالچ دے کر پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں تو مرزا یوں جواب دیتے ہیں "جی نہیں، مجھے یہ بھی منظور نہیں ہے۔ میں کئی کمپنیوں کا ڈائریکٹر کئی کا مینجنگ ایجنٹ کئی کا چیرمین تھا۔ دولت میرے پاؤں چومتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ دولت سے آرام و تکلیف کے کتنے سامان جمع کیے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ دولت انسان کو کتنا خود غرض بنا دیتی ہے، کتنا عیش پسند، کتنا مکّار اور کتنا بے غیرت۔" جب مرزا صاحب شراب پینے کے لیے گوبر سے پیسا مانگتے ہیں اور وہ انکار کر دیتا ہے تو پریم چند مرزا کے کردار کو یوں پیش کرتے ہیں۔ "جب گوبر نے اب کے بھی انکار کیا تو مرزا صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ شہر میں ان کے ہزاروں ملنے والے تھے۔ کتنے ہی ان کی بدولت بن گئے تھے۔ کتنوں ہی کی آڑے وقت پر انہوں نے مدد کی تھی مگر ایسوں سے وہ ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے، انہیں ہزاروں لٹکے معلوم تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً روپیوں کا ڈھیر لگا سکتے تھے مگر روپئے کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ اُن کے ہاتھ میں روپے جیسے کاٹتے تھے۔ کسی نہ کسی بہانے اڑا کر ہی اُن کا دل سکون پاتا تھا۔" مرزا کو پریم چند نے ایک فیاض، عیاش، لیکن نیک باطن کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ ان پر یہ الزام لگانا کہ وہ مسلمان کرداروں کو ظالم اور بدکردار یا تنگ نظر کے طور پر پیش کرتے ہیں قطعاً لغو اور بے بنیاد بات ہے۔

پریم چند ہندی، اردو تنازعے کے متعلق بھی بڑا صاف ذہن رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسی جاندار

www.taemeernews.com

زبان کے قائل تھے جو عام فہم ہو اور رابطے کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس زبان کو اردو یا دیوناگری کسی بھی رسم خط میں لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں: "رسم الخط کا فیصلہ وقت کرے گا۔ جو زیادہ جاندار ہے وہ آگے آئے گا۔ دوسرا پیچھے رہ جائے گا۔ رسم خط کے اختلاف کی بحث کرنا گھوڑے کے آگے گاڑی کو رکھنا ہے۔ ہمیں اس شرط کو مان کر چلنا چاہیے کہ ہندی اور اردو دونوں ہی قومی رسم خط ہیں اور ہمیں اختیار ہے ہم چاہے جس رسم خط میں اس کو استعمال کریں۔" زبان کے معاملے میں یہ پریم چند کی نیک نیتی ہی تھی کہ انہوں نے ایک بڑی ہی معقول اور ٹھوس تجویز رکھی تھی کہ شمالی ہندوستان کے اسکولوں میں دسویں جماعت تک اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی تعلیم لازمی کر دی جائے۔ اس کے نتیجے میں دونوں زبانوں کا ارتقا اس ڈھنگ سے ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آتی جائیں گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب دونوں زبانیں ایک ہو جائیں گی۔ قمر رئیس بالکل صحیح کہتے ہیں: "پریم چند ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جو عرفان رکھتے تھے اور اس کے تحفظ کے لیے انہوں نے جو تگ و دو کی، جیسی قربانیاں دیں، یہ سعادت اردو کے بہت کم ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ ادیب سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں، اس کے آگے مشعل ہاتھ میں لے کر چلنے والی سچائی ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی سماج کے تضادات کو جس طرح سمجھا تھا اور اس کے سماجی، تہذیبی اور لسانی مسائل کا جو دانشمندانہ حل پیش کیا تھا اگر اس پر عمل ہو سکتا تو کم از کم آج ملک کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی اور ہو رہی ہے۔ پریم چند سچ مچ سیاست کے آگے مشعل لے کر چلنے والی سچائی تھے۔"

www.taemeernews.com

8

یہ کہنا کسی طرح کا مبالغہ نہ ہوگا کہ پریم چند نے اپنا قلم ہندوستان کے دیہات، اور اس میں بسنے والے غریب کسانوں کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو مؤثر طریقے سے پیش کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ ان کی شاہکار کہانی "کفن" اور ان کا شاہکار ناول" گئودان" دونوں ہی ہندوستانی دیہات کی زندگی سے متعلق ہیں اور دونوں کے مرکزی کردار غریب کسان طبقے اور اُن کی جینے کی جدوجہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر پریم چند کی دیہاتی زندگی اور غریب کسانوں کے روزمرہ مسائل پر گہری نظر نہ ہوتی تو ایسے شاہکاروں کی تخلیق ممکن نہ ہوتی۔ پریم چند کی تخلیقات میں ہمیں شمالی ہندوستان کے دیہاتوں کے یادگار خاکے ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ جاندار خاکے ہمیں آج بھی اوروں کے یہاں مشکل ہی سے ملیں گے۔ ڈاکٹر پی۔ سی۔ جوشی کا خیال ہے کہ بالزاک، ژولا، اور ڈکنس جاگیرداری نظام کے زوال پر گہری نظر رکھنے اور تخلیقی ادب میں اس سے وابستہ انسانی ڈرامے کو پیش کرنے سے عالمی ادب میں امر ہو گئے اور پریم چند نے ناول نگار کی حیثیت سے عالمی ادب میں مرتبہ حاصل کر لیا کیونکہ اُن کا قلم زندگی سے دھڑکتے ہوئے وہ المناک مرقعے پیش کرتا ہے جو ہندوستانی دیہات پر برطانوی سامراج کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ کچھ اختلاف کے باوجود پی۔ سی۔ جوشی سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پریم چند

www.taemeernews.com

خود کسان نہیں تھے، نہ ہی کسان جاتی سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ البتہ وہ اپنے دیہات بلھی میں ان کے قریب ضرور رہے تھے اور اپنے تعلیمی پیشے میں انہیں ماسٹر کی حیثیت سے اور پھر انسپکٹر کی حیثیت سے بھی اکثر کسانوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اُن کی دردں بینی اور سینے میں دھڑکتا ہوا انسانی ہمدردی سے معمور دِل یہی ان کا قیمتی اثاثہ تھا جس نے ان کے قلم سے کسانوں کی غربت اور استحصال کے ایسے زندہ جاوید مرقعے بنوائے۔

گوبر جب شہر میں رہ کر دوسری بار اپنے گاؤں لوٹتا ہے تو اپنے گھر اور گاؤں کی حالتِ زار اس سے دیکھی اور سہی نہیں جاتی۔ پریم چند اس وقت کسانوں کی حالتِ زار کا نقشہ "گئودان" میں یوں پیش کرتے ہیں:

"گوبر نے گھر پہنچ کر وہاں کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اُسی وقت واپس جائے۔ گھر کا ایک حصّہ گرنے کے قریب تھا۔ دروازے پر صرف ایک بیل بندھا ہوا تھا اور وہ بھی ادھ مرا سا۔ دھنیا اور ہوری دونوں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ مگر گوبر کا جی اچاٹ تھا۔ اب اس گھر کے سنبھلنے کی کیا امید ہے؟ وہ غلامی کرتا ہے مگر پیٹ بھر کھاتا تو ہے۔ صرف ایک ہی مالک کا تو نوکر ہے۔ یہاں تو جسے دیکھو وہی رُعب جماتا ہے۔ غلامی ہے مگر خُشک! محنت کر کے اناج پیدا کرو اور جو روپے ملیں وہ دوسرے کو دے دو اور آپ بیٹھے ہوئے "رام رام" جپو۔ دادا ہی کا کلیجہ ہے کہ یہ سب سہتے ہیں اُس سے تو ایک دن نہ سہا جائے اور یہ حالت کچھ ہوری ہی کی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر یہی مصیبت تھی۔ ایسا ایک آدمی بھی نہیں جس کی حالت زار نہ ہو۔ گویا جسم میں جان کے بجائے کلفت ہی بھری ہوئی لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہی تھی۔ چلتے پھرتے تھے، کام کرتے تھے، پستے تھے، صرف اس لیے کہ ایسا ہونا ان کی قسمت میں

www.taemeernews.com

لکھا تھا۔ زندگی میں نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی امنگ، گویا ان کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہوں اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو۔ جیٹھ کے دن ہیں، ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ مگر کسی کے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔ بہت کچھ اناج تو کھلیان ہی میں تُل کر مہاجنوں اور کارندوں کی نذر ہو چکا ہے اور جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی دوسروں ہی کا ہے۔ مستقبل تاریکی کی طرح ان کے سامنے ہے جس میں انہیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔"

اور اس پستی اور غربت کا نتیجہ بھی کتنا بھیانک ہے: "اُن سے دھیلے دھیلے کے لیے بے ایمانی کرالو، مٹھی بھر اناج کے لیے لاٹھیاں چلوالو۔ پستی کی وہ انتہا ہے جب آدمی عزت و غیرت کو بھی بھول جاتا ہے۔"

لیکن پریم چند کی کسانوں اور ان کے بے رحمانہ استحصال سے ہمدردی اُن کے ادب میں سستی جذباتیت پیدا نہیں کرتی۔ اُن کا قلم حقیقت نگار ہے اور حقیقت نگاری کا دامن اُن سے نہیں چھوٹتا۔ وہ دیہات اور کسانوں کا کوئی رومانی تصور قائم نہیں کرتے۔ اُن کے پیر دیہات کی سنگلاخ زمین پر ہی جمے رہتے ہیں، محض تخیل کے سہارے خیالی دنیا میں پرواز نہیں کرتے. وہ کسان کی فطرت کو بھی اسی طرح پیش کرتے ہیں جیسی اُسے اپنے مشاہدے کے ذریعے پاتے ہیں۔ اس کی کمزوریوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ چنانچہ "گئودان" میں کسان کی فطرت کو انہوں نے یوں پیش کیا ہے:

"کسان پکا سوارتھی ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اس کی گانٹھ سے رشوت کے پیسے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ میں بھی وہ چوکس ہوتا ہے سود کی ایک ایک پائی چھڑانے کے لیے وہ مہاجن کی گھنٹوں خوشامد کرتا ہے۔ جب تک پورا یقین نہ

www.taemeernews.com

ہو جائے وہ کسی کے بہکانے میں نہیں آتا، لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا پورا ساتھ دیتے ہوئے گذرتی ہے۔"

پریم چند نے ہم اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں، کسان کے ساتھ کہیں رعایت نہیں کی اس کی فطرت کو جیسا پایا ویسے ہی پیش کر دیا۔ پریم چند کا یہی حقیقت پسندانہ رویہ ہے جو سستی جذباتیت سے ان کا دامن بچائے رکھتا ہے ورنہ "گئودان" میں ہی کئی ایسے مواقع تھے کہ کم درجے کا فن کار اس جذباتیت کا آسانی سے شکار ہو جاتا۔

پریم چند حقیقت نگار تھے اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں سماجی حقیقت کو جوں کا توں پیش نہیں کیا بلکہ اس کی طرف انتقادی رویہ اختیار کیا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پریم چند انتقادی حقیقت نگار تھے۔ وہ اپنے دور کے موجودہ سماج سے قطعاً مطمئن نہیں تھے اُن حالات کو جن کی وجہ سے کسان کو اتنی محنت و مشقت کے باوجود دو وقت کی اطمینان سے روٹی تک میسّر نہیں ہوتی تھی بدلنا چاہتے تھے۔ پریم چند نظریات کے اعتبار سے کئی ارتقائی مراحل سے گذرے۔ اپنے ابتدائی دور میں، جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں، وہ آریہ سماج کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کی اکثر کہانیاں اس دور میں مذہبی اور سماجی اصلاح کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ پھر وہ قومی جنگِ آزادی میں کود پڑے اور مہاتما گاندھی کے نظریات سے بیحد متاثر ہوئے۔ گاندھی جی خود کسان کی غربت اور فلاکت پر کُڑھتے تھے مگر وہ تالیف قلب پر یقین رکھتے تھے اور برے اور استحصال کرنے والے زمینداروں کو اچھے اور نیک زمینداروں میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ زمیندار اپنے طبقاتی مفاد کو سچائی اور نیکی کی طاقت پر قربان کر سکتا ہے۔ شروع شروع میں پریم چند نے بھی گاندھی جی کے زیرِ اثر یہی رویہ اختیار کیا اور تالیف قلب پر زور دیتے رہے۔ "میدانِ عمل" اور "گوشۂ عافیت" اسی قبیل کے ناول ہیں۔

www.taemeernews.com

"میدانِ عمل" پریم چند نے 1930ء اور 1932ء کے درمیانی وقفے میں لکھا ہے اور پریم چند کی زندگی کا یہ دوران کے ذہنی اور نظریاتی تبدیلی میں اہم موڑ کا دور ہے۔ میدانِ عمل میں اس تبدیلی کی نشاندہی کی گئی ہے کیونکہ اس ناول میں ہمیں پہلی مرتبہ طبقاتی مفادات اور مزدوروں اور کسانوں کی طبقاتی جدوجہد کا قدرے واضح شعور ملتا ہے۔ لیکن اب تک پریم چند نے فیصلہ کُن موڑ اختیار نہیں کیا تھا اگرچہ اس ناول کے کئی کردار گاندھی وادی پریم چند کے انحراف کا پتہ دیتے ہیں لیکن اس میں پرانا آدرش واد بھی موجود ہے۔

پریم چند کے ذہنی رویّے میں تبدیلی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ 1929ء سے عالمی کساد بازاری شروع ہو چکی تھی اور کسانوں کی مفلوک الحالی میں اور ابتری پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود زمینداروں کا استحصال کم نہ ہوتا تھا۔ نہ ہی سرکاری عہدے دار اُن کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کے لیے تیّار تھے۔ پریم چند اکثر دیہاتوں کا دورہ کرتے اور اس ابتری اور کسانوں کی بے بسی کا مشاہدہ کرتے۔ ظاہر ہے لیے دل شکن حالات میں زمینداروں کی تالیف قلب پر ایمان لانا پریم چند جیسے حساس فن کار کے لیے بہت مشکل تھا۔" میدانِ عمل "میں اس کساد بازاری اور بے رحمانہ استحصال کا ذکر بھی آتا ہے چنانچہ اس ناول کا ایک کردار امرکانت کہتا ہے :

> " یکایک جنسوں کا بھاؤ گر گیا اور اس حد تک جا پہنچا جتنا چالیس سال پہلے تھا... جب دو اور تین کی جنس ایک میں بکے تو (کسان) غریب کیا کرے۔ کہاں سے لگان دے. کہاں سے دستوریاں دے۔ کہاں سے قرض چکائے .... اور یہ حالت کچھ اس علاقے کی نہ تھی۔ سارے صوبے۔ سارے ملک۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی کساد بازاری تھی "

ایک طرف کسانوں کی یہ مفلوک الحالی ہے اور دوسری طرف اسی علاقے کے زمیندار مہنت آشارام کی

www.taemeernews.com

عیش وعشرت کی زندگی ہے ۔ ان کے عالی شان محل میں ٹھاکر دوارہ بھی ہے ۔ آشارام اور ان کے بھگت اور مرید انواع واقسام کی غذائیں تناول کرتے ہیں ۔ پھل، میوے، عطر، تیل ، اگر اور چندن کے ساتھ ریشمی کپڑے اور قیمتی تحائف بھی موجود ہیں ۔ فیل خانے میں ہاتھی جھومتے ہیں ۔ اصطبل میں ایک سے ایک اعلیٰ گھوڑے ہیں جنہیں کھانے کے لیے بادام اور ملائی دی جاتی ہے اور انتہا یہ ہے کہ مہنت جی روز آرتی سے پہلے پانچ من دودھ سے نہاتے ہیں ۔ امرکانت اس الف لیلوی زندگی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے ۔ کسانوں کے پاس تو کڑی محنت ومشقت کے باوجود مہنت جی کے لگان کی آدھی رقم چکانے کے پیسے ہیں نہ پیٹ بھر چٹنی روٹی کھانے کے ۔ لیکن مہنت جی کے کارکن ہیں کہ جبر اور طاقت سے لگان کی رقم وصول کرنے پر تُلے ہوئے ہیں ۔ آتمانند جو قدرے انتہا پسند ہے امرکانت کی اس تجویز سے اختلاف کرتا ہے کہ مہنت جی سے لگان میں چھوٹ کی محض درخواست کی جائے ۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ سب کسان چل کر مہنت جی کے مکان کا محاصرہ کرلیں اور جب تک وہ کسانوں کے مطالبات نہ مانیں ٹھاکر دوارے میں کوئی کام نہ ہونے دیں ۔ لیکن عمل امرکانت کی تجویز پر ہی ہوتا ہے ۔ وہ مہنت جی اور علاقے کے حاکم سے مل کر لگان میں رعایت کی اپیل کرتا ہے لیکن محض اس لیے گرفتار کرلیا جاتا ہے کہ وہ جذباتی تقریر کرتا ہے اور اس واقعہ کے بعد اس علاقے کے کسان آتمانند کی قیادت میں جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ حکومت کی ساری مشینری ، فوج ، پولیس مہنت جی کی حمایت میں آجاتی ہے اور پورے علاقے میں دہشت کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے ۔ گویا پریم چند مہنت آشارام کے کردار میں مذہب، سرمایہ داری اور زمیندارانہ اقتدار کو یک جا کردیتے ہیں ۔ اسی لیے ان کے دوست دیانرائن نگم "زمانہ" کے پریم چند نمبر میں لکھتے ہیں :

> "پریم چند نابرابری کی لڑائی میں سمجھوتہ کے خیال سے مشتبہ رہتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا ۔ اور وہ اس کے لیے قوم کو جلد سے جلد

www.taemeernews.com

تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت سے ٹکر لیے بغیر کام نہ چلے گا۔"

ان تمام باتوں کے باوجود اس ناول میں پریم چند کا رویہ مذبذب ہے۔ وہ ستیہ گرہ اور عدم تشدد سے مایوس ہو چکے ہیں لیکن اب بھی فیصلہ کن انداز میں اس سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی یہ رائے بالکل درست ہے: "واقعہ یہ ہے کہ پریم چند اس ناول میں متوسط طبقہ کی قیادت کو شک کی نظروں سے ضرور دیکھتے ہیں لیکن ابھی اس پر ان کا اعتقاد باقی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس کی کمزوریوں اور غلط کاریوں کا ادراک رکھنے کے باوجود انہیں اس سے ہمدردی تھی۔ یہی سبب ہے کہ آتمانند کے مقابلہ میں وہ آخر امر کانت اور اس کے عقائد کی جیت دکھاتے ہیں۔"

لیکن میدانِ عمل کے برخلاف گئودان پریم چند کے اصلاحی نظریے سے فیصلہ کُن علیحدگی اور فنی پختگی کا ثبوت ہے۔ گئودان میں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ پریم چند کا اب اصلاح اور تالیف قلب پر ایمان نہیں رہا۔ رائے صاحب جو ایک روشن خیال زمیندار ہیں اور غریب کسانوں سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے طبقاتی مفادات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ رائے صاحب کو اپنے طبقاتی کردار اور اُن کے طبقے کے ذریعے کیے جانے والے استحصال کا اچھی طرح شعور ہے۔ انہیں اپنی طبقاتی مجبوریوں اور میکانزم کا بھی احساس ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"ہمارے پاس علاقے۔ محل، سواریاں۔ نوکر چاکر۔ قرض۔ بیسوائیں کیا نہیں ہیں؟ مگر جس کے دل میں طاقت نہیں، خودداری نہیں وہ اور چاہے کچھ ہو انسان نہیں ہے۔ جسے دشمن کے خوف سے رات کو نیند نہ آتی ہو۔ جس کے دکھ پر سب ہنسیں اور رونے والا کوئی نہ ہو۔ جس کی چوٹی دوسروں کے پیروں کے نیچے دبی ہو، جو عیش و عشرت کے نشے میں اپنے کو بالکل بھول گیا ہو۔ جو حاکموں کے تلوے چاٹتا ہو اور اپنے ماتحتوں کا خون

www.taemeernews.com

چوستا ہو، اسے میں سکھی نہیں کہتا وہ تو دنیا کا سب سے بڑا بدنصیب جاندار ہے۔"

لیکن حقیقت اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس احساس کے باوجود رائے صاحب اپنی موجودہ حالت کو ہی پسند کرتے ہیں۔ اپنے عیش و عشرت کے لیے اُنہیں حاکموں کے تلوے چاٹنے کی ذلت بھی گوارا ہے اور اپنے آسامیوں یعنی غریب کسانوں کا خون چوسنے کی غیر انسانی حرکت بھی۔ حالانکہ ہوری ان کا نہایت وفادار اور جہتیا آسامی ہے لیکن جب گاؤں کی پنچایت اس کے بیٹے گوبر کی ایک نچلی ذات کی اہیرن لڑکی سے شادی ہو جانے پر ہوری پر سخت جرمانہ عائد کرتی ہے اور اس کی خبر رائے صاحب کو ملتی ہے تو رائے صاحب پنچوں پر اور اپنے کارندوں پر اس لیے ناراض نہیں ہوتے کہ ہوری پر جرمانہ کر کے اسے کیوں تباہ کیا گیا بلکہ اس لیے کہ جرمانے کی رقم انہیں نہ دیتے ہوئے پنچ اور کارندے ہی کیوں ہضم کر گئے۔ گویا پریم چند اب سماج کے طبقاتی کردار سے بھی اور انسانی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں اور طبقاتی مفادات اور انسانی شعور کے تضادات کو گہرائی میں اُتر کر سمجھتے ہیں اور ان کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ سماجی مسائل کا باریکی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے آدرش وادا در اصلاح پسندی سے آزاد نہ ہوئے ہوتے تو رائے صاحب کا کردار "گئودان" میں کچھ اور ہی ہوتا۔ "گئودان" میں پریم چند نے رائے صاحب کے تہ دار اور پیچیدہ کردار کو پیش کر کے یہ بات جتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جب تک سماج کا طبقاتی کردار نہیں بدلتا رائے صاحب جیسے باشعور اور روشن خیال زمیندار بھی ایسے سماج میں رہتے ہوئے اپنے مفادات سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ حیاتیاتی جبلت کو چھوڑ کر انسانی جبلت ایک ایسا قابلِ تغیر حصہ ہے جس کا دارومدار سماجی ساخت و پرداخت پر ہوتا ہے۔ رائے صاحب جیسے افراد کی جبلت کچھ اور ہی ہوتی اگر سماجی ساخت و پرداخت میں ذاتی ملکیت بنیادی حیثیت نہ رکھتی — اس لیے محض تالیف قلب سے سماج نہیں بدل سکتا کیوں کہ طبقاتی سماج میں انسان کے لیے (کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر) اس کے مادی مفادات ہی زیادہ اہم اور فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ آدرش اور مفادات

www.taemeernews.com

کی کش مکش میں اکثر آخرالذکر کی ہی فتح ہوتی ہے ۔

پریم چند نے گئو دان میں کسانوں کے استحصال کا بڑا دلدوز نقشہ کھینچا ہے ۔ "گئو دان" پڑھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ پریم چند نے دیہات کی زندگی کا بڑا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ کسان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو "گئو دان" میں اُن کی قلم کی زد میں نہ آیا ہو۔ وہ استحصال کے مختلف پہلوؤں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ گوبر ہوری کے تھوا رپر مہاجن کی نقل کراتا ہے ۔ کسان کو مہاجن کس طرح نچوڑتا ہے اس کا یہ بڑا سچا نمونہ ہے ۔ پریم چند اسے یوں بیان کرتے ہیں :

"کسان آکر اور ٹھاکر کے پیروں پر گر کر رونے لگتا ہے ۔ بڑی مشکل سے ٹھاکر روپے دینے پر راضی ہوتے ہیں ۔ جب کاغذ لکھ جاتا ہے اور اسامی کے ہاتھ میں پانچ روپے رکھ دیے جاتے ہیں تو وہ چکرا کر پوچھتا ہے "یہ تو پانچ ہی ہیں ، مالک"!
"پانچ نہیں دس ہیں ، گھر جا کر گننا!"
"نہیں سرکار ، پانچ ہیں"!
"ایک روپیہ نجرانے کا ہوا کہ نہیں ؟"
"ہاں سرکار"
"ایک لکھائی کا ؟"
"ہاں سرکار"
"ایک کاگد (کاغذ) کا ؟"
"ہاں سرکار"
"ایک دستوری کا ؟ "
"ہاں سرکار"

www.taemeernews.com

"پانچ نگد، دس ہوئے کہ نہیں؟"

"ہاں سرکار! اب یہ پانچوں بھی میری طرپھ سے رکھ لیجیے۔"

"کیسا پاگل ہے؟"

"نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کا نجرانہ ہے اور ایک بڑی ٹھکرائن کا۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے کو اور ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کو۔ رہا ایک روپیہ سو وہ آپ کے کریاکرم کے لیے۔"

دراصل مکالمے کے ان آخری جملوں میں نہ صرف گہرا طنز ہے بلکہ ان میں کسان کا اپنا شعور بھی چھپا ہوا ہے۔ اس کا جس طرح مہاجنوں اور زمینداروں کے ہاتھ استحصال ہوتا ہے وہ اچھی طرح سمجھتا ہے لیکن اس پورے نظام میں وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے دست و پا پاتا ہے۔ بعض ناقدوں نے "گئودان" پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا مرکزی کردار ہوری بغاوت نہیں کرتا اور خاموشی سے سارے مظالم برداشت کرتا رہتا ہے۔ میرے خیال سے یہ اعتراض بہت ٹھوس نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا ظالمانہ نظام یقیناً بغاوت کا متقاضی ہے اور بغاوتیں ہوئی بھی ہیں لیکن شروع سے ہوری کے کردار کا اٹھان ایسا ہے کہ جو ہندوستانی دیہاتی معاشرے کی تقدیر پرستی سے میل کھاتا ہے۔ ہوری کا بغاوت کرنا اس کے کردار اور اس معاشرے اور اس نسل کے مزاج کے خلاف جاتا ہے جس کی وہ پیداوار ہے اور یہ پریم چند کے لیے حقیقت نگاری کے خلاف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقت نگاری محض خارجی حالات کی عکاسی نہیں ہے اس میں نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کا تصور اور آدرش اور موجودہ حقیقت کی طرف ناقدانہ رویہ بھی شامل ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ حقیقت کی بعض باتیں اتنی بنیادی ہوتی ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا حقیقت نگاری کو مجروح کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہوری کو پریم چند نے موجودہ سماج کا ایک نمائندہ کردار کے طور پر پیش کیا ہے اور گوبر کو نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کے نمائندے کے طور پر۔ گوبر کے مزاج

www.taemeernews.com

میں نہ صرف بغاوت ہے بلکہ وہ گاؤں کے مقابلے میں شہر کو پسند کرتا ہے۔ شہر نئی صنعتی تہذیب کی علامت ہے اور گاؤں پرانی جاگیردارانہ تہذیب کی۔ گوبر کا دیہات سے شہر کو جانا بھی نئی ابھرتی ہوئی تہذیب کی طرف منتقلی کی علامت ہے۔

پریم چند کو جتنی ہمدردی کسانوں کے ساتھ تھی اتنی ہی ہمدردی اُنہیں اچھوتوں سے بھی تھی۔ مذہب کی طرف اُن کا شروع سے ہی ناقدانہ رویہ رہا تھا اور اسی رویے نے انہیں آریہ سماجی تحریک کی طرف راغب کیا تھا۔ چنانچہ وہ ذات پات کی تقسیم اور چھوت چھات کی لعنت کے سخت مخالف تھے۔ بعد میں تو وہ سوشلزم کو اپنا لیتے ہیں لیکن اس سے قبل وہ گاندھی جی کی تحریک کے زیرِ اثر بھی اسی سماجی لعنت کے خلاف جہاد کر چکے تھے۔

پریم چند شروع ہی سے انسانوں کو مساوی درجہ دینے کے قائل تھے۔ لیکن ہندو سماج اور مذہب نے لاکھوں انسانوں کو اچھوتوں کا درجہ دے رکھا تھا اور انہیں ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ انتہا تو یہ ہے کہ اُن کو اپنے دُکھی من کی کہانی بھگوان کے در پہ جا کر بھی کہنے کی ممانعت تھی۔ مذہب کے ٹھیکیداروں نے مندروں میں ان کا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا اور اس کے بھی روادار نہیں تھے کہ ان کے کانوں میں مقدس کتابوں کے بول داخل ہوں۔ پریم چند ایسی ظالمانہ پابندیوں کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔ "میدان عمل" میں جب مٹھوا مندر کے دروازے پر بیٹھ کر کتھا سنتا ہے تو مندر کا پجاری لالہ سمرکانت اور سیٹھ دھنّی رام کے اشارے پر اسے جوتوں سے پیٹتا ہے۔ اس پر ایک سماج سیوک ڈاکٹر شانتی کمار ان الفاظ میں احتجاج کرتے ہیں۔ یہاں پریم چند نے دراصل اپنے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے:

> "آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لیے۔ لگائیے خوب کس کس کر، اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ بندوقیں منگائیے اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کر دیجیے۔ اور تم دھرم کو ناپاک

www.taemeernews.com

کرنے والو تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھا سکو کھاؤ۔ تمہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ، مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں..... یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں۔ موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے "

یہاں بھی پریم چند نے مذہب کے ساتھ ساتھ سماجی نظام پر بھی گہری چوٹ کی ہے۔ بھگوان بھی ہر طرح سے سرمایہ دارانہ نظام کی علامت ہے۔ جواہرات، زیور، لذیذ کھانے اور مٹھائیاں یہ سب سرمایہ داروں یا طبقاتی سماج کے اعلےٰ طبقوں کے لچھن ہیں۔ پریم چند یوں چھوت چھات کے مسئلے کو سماجی نظام کے مسئلے سے جوڑ دیتے ہیں۔ مذہبی رواداری تو اچھوتوں کی طرف زیادہ سے زیادہ ترحم کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ پریم چند کا مقصد اچھوتوں کے ساتھ محض بہتر برتاؤ کرنا نہیں بلکہ اس لعنت کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب سماجی نظام کو ہی بدلا جائے۔

اچھوتوں کا مسئلہ سماجی نظام سے کس طرح جڑا ہوا ہے اس کی تصویر ہمیں پریم چند کے ناول "پردۂ مجاز" میں نظر آتی ہے۔ گاؤں میں ہریجنوں سے بیگار لینا بہت عام رہا ہے اور یہ پرتھا آج بھی موجود ہے۔ دراصل یہ پرتھا جاگیردارانہ نظام کی دین ہے۔ اگر اچھوتوں نے کبھی مزدوری مانگی یا بیگار سے انکار کیا تو ان پر طرح طرح کے مظالم ہوتے تھے، انہیں ہنٹروں سے پیٹا جاتا تھا اور گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا۔ "پردۂ مجاز" میں دیوان صاحب کے گھوڑوں کو وقت پر گھاس اس لیے نہیں مل پاتی کہ بھوکے چمار تیزی سے گھاس نہیں کاٹ پا رہے تھے۔ دیوان صاحب کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ چمار بھوکے ہیں، ان کے گھوڑوں کو وقت پر گھاس ملنی چاہیے ورنہ ان کو ایسی کڑی سزائیں دی جاتی تھیں کہ:

"یکایک مزدوروں کے باڑے سے گریہ وزاری کی صدائیں آنے لگیں۔ کسی کیمپ میں

www.taemeernews.com

گھاس نہیں تھی اور دیوان صاحب ہنٹر لیے چماروں کو پیٹ رہے تھے .... ایک چمار بولا مالک آپ کو اکھتیار ہے مار ڈالیے ۔ پیٹ باندھ کر کام نہیں ہوتا.... ایک نوجوان نے کہا ہم لوگ بنا گھاس کھائے آٹھ دن سے گھاس دے رہے ہیں کیا گھوڑے بنا کھائے ایک دن بھی نہ دوڑیں گے ..... دیوان صاحب نے جھپٹ کر اسے چار پانچ ہنٹر لگا دیے برہنہ جسم کی جلد کٹ گئی اور خون بہہ نکلا .... وہی ہنٹر تان کر چودھری کو جما دیا بوڑھا آدمی تھا اس پر کئی دن کا بھوکا ہنٹر پڑتے ہی گر پڑا۔"

سرکاری حکام بھی اس زمانے میں ہر یجنوں سے بیگار لیا کرتے تھے ۔ اور اسی طرح ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھتے تھے ۔ اس کی تصویر کشی پریم چند نے اپنے دوسرے ناول "گوشۂ عافیت" میں کی ہے ۔ ضلع حکام کا لشکر گاؤں والوں کی فلاح و بہبود کے بہتر مواقع فراہم کرنے کی غرض سے ان کے موجودہ حالات کی جانچ پڑتال کرنے آتا ہے ۔ مگر یہ سرکاری حکام بھی اچھوتوں پر اسی طرح ظلم ڈھاتے ہیں اور انہیں بیگار کے لیے مجبور کرتے ہیں ۔ اچھوت ان لشکر والوں کی جان توڑ خدمت کرتے ہیں لیکن لشکر والوں کو ان کی بھوک پیاس کسی چیز کا خیال نہیں رہتا ۔ جب افلاس زدہ اچھوت سخت محنت کرنے کے بعد مزدوری مانگتے ہیں تو تحصیلدار غصے میں پاگل ہو کر چپراسیوں کو حکم دیتا ہے" ان چماروں کی اچھی طرح خبر لیں ۔ یہی ان کی مزدوری ہے ۔ چپراسیوں نے بیگاریوں کو گھیرنا شروع کیا ۔ کانسٹبلوں نے بھی بندوقوں کے کندے لگانا شروع کیے ۔ کئی آدمی مضروب ہو گئے ۔" یہ سارا نظام ایسا ہے کہ زمیندار اور سرکاری حکام تو بیگار ان اچھوتوں سے لیتے ہی ہیں لیکن حد تو یہ ہے کہ مہنت اور پجاری بھی انہیں معاف نہیں کرتے ۔ پریم چند کے ایک افسانے "نجات" کا ایک کردار پروہت کی بیگار کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے" زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے ۔ حاکم بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے ۔ یہ ان سے بھی بڑھ گئے ۔" یعنی پروہت تو بیگار لینے کے بعد کچھ بھی دینے پر رضامند نہیں ہوتا ۔

www.taemeernews.com

"نجات"، میں دکھی چمار صبح اٹھتے ہی پنڈت جی کے لیے بیگار میں لگ جاتا ہے۔ تمام دن بغیر کھائے پیے لکڑی پھاڑتے ہوئے چکر کھا کر گر جاتا ہے تو "پنڈت جی نے پکارا، اُٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے" مگر بے چارہ دُکھی چمار تو مر چکا تھا۔ مگر مرنے کے بعد بھی پنڈت جی کو اس پر رحم نہیں آتا۔ زندگی بھر بیگار لیتے رہے اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو رسّی سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر پھینک آئے۔ پریم چند لکھتے ہیں :

"دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گِدھ، اور کوّے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی اور خدمت کا انعام تھا"۔

آزادی کے 30. 35 سال بعد بھی اچھوتوں کا مسئلہ حل طلب ہے۔ بیگار اور بندھوا مزدوری کی لعنتیں آج بھی ہمارے سماج میں موجود ہیں اور یہ اسی نیم جاگیردارانہ نظام کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ پریم چند کی ان کہانیوں میں کہیں بھی مبالغہ نہیں ہے۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے ہریجنوں پر ہوریے ان مظالم کو دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی انہیں زندہ جلا دینے، معمولی معمولی بات پر گولی مار دینے کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں پریم چند کی ایک اور کہانی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ بڑی دل ہلا دینے والی کہانی ہے۔ اس کا عنوان ہے "دودھ کی قیمت"۔ امرت رائے اس کہانی کے متعلق "قلم کا سپاہی" میں لکھتے ہیں" دودھ کا دام (کہانی کا ہندی عنوان) یوں تو وہی چھوت اچھوت، اونچ نیچ کی کہانی ہے لیکن اب غصّے کی جگہ دل کو مسوس دینے والے، چیر دینے والے ایک درد نے لے لی ہے، 'مندر' جیسی کہانی میں جو آکروش کی ایک چیخ تھی وہ یہاں درد کی ایک میڈ بن گئی ہے"۔ کہانی اس طرح ہے۔ ایک غریب بھنگی ماں اپنے دودھ پیتے بچّے کو بھوکا رکھ کر ایک بابو صاحب کے بچّے کو، جس کی ماں کو دودھ نہیں اُترا، دودھ پلانے کے لیے نوکری کر لیتی ہے۔ سال بھر یہ سلسلہ چلتا ہے اور پھر سماجی ٹھیکیدار اس بات پر معترض ہوتے ہیں اور بھنگن کو نکال دیا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

آگے چل کر اس بھنگن کا شوہر پلیگ کا شکار ہو کر مر جاتا ہے اور وہ خود ایک نالہ صاف کرتے ہوئے سانپ کاٹنے سے مر جاتی ہے۔ اس کا لڑکا منگل اب اس دنیا میں اکیلا ہے اور اسی بابو صاحب کے ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کے پیڑ کے نیچے ایک پھٹے سے ٹاٹ کے ٹکڑے، دو مٹی کے برتن اور ایک دھوتی جو سریش بابو کی اُترن تھی، اس اثاثے کے ساتھ رہتا ہے۔ جھلستی ہوئی لو ہو یا کڑاکے کی سردی یا موسلا دھار بارش، اس کا ٹھکانہ وہی تھا۔ اس کا اپنا کوئی ساتھی تھا تو ایک کتا۔ دونوں ایک ہی کھانا کھاتے، ایک ہی ٹاٹ پر سوتے۔ اس کتے کا نام تھا ٹامی۔ منگل اور ٹامی میں گہری چھنتی تھی۔ منگل کہتا دیکھو بھائی ٹامی، ذرا اور کھسک کر سو۔ آخر میں کہاں لیٹوں سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا۔ ٹامی غوں غوں کرتا، دم ہلاتا اور کھسک جانے کے بدلے اور اوپر چڑھ آتا اور منگل کا منھ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ ایک دن آس پاس کے بچے جن میں سریش بابو کا لڑکا بھی شامل ہے اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے کہتے ہیں۔ پہلے منگل ڈرتا ہے کہ مالک کو پتہ لگ گیا تو اُسے ماریں گے لیکن جب وہ کھیلنے پر راضی ہوتا ہے تو اُسے سب گھوڑا بننے کے لیے کہتے ہیں تاکہ دوسرے بچے اس پر سواری کر سکیں کیونکہ آخر وہ بھنگی ہے۔ منگل اس بات پر اڑ جاتا ہے کہ اگر وہ گھوڑا بنے گا تو دوسروں کو بھی بننا پڑے گا۔

منگل کا یہ سوال ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ سوچ کر کہا تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا، سوچ؟ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں؟ منگل بھی کڑا ہو گیا! بولا۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں، لیکن تمہیں میری ماں ہی نے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی میں گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ بڑے ہو شیار ہو۔ آپ تو مزے سے سواری کرو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا! ہوتے ہوتے اس سوال پر جھگڑا ہوا اور منگل کو بری طرح پھٹکار پڑی۔ اس کے نازک احساسات کو اتنی شدید چوٹ پہنچی کہ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ سریش بابو کے گھر کا کھانا نہیں کھائے گا۔

www.taemeernews.com

لیکن پیٹ کی مار آخر عزتِ نفس کے احساس سے زیادہ جان لیوا ہوتی ہے ۔ منگل کا اور کوئی سہارا نہ تھا۔ آخر بار کر وہیں جھوٹے پتّل چاٹنے پہنچا۔ آخری منظر بڑا دل دوز ہے ؛ اس نے پتّل کو اٹھا کر منگل کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ منگل نے اس کی اور ایسی آنکھوں سے دیکھا جن میں ممنونیت کا احساس بھرا ہوا تھا ۔ٹامی بھی اندر سے نکل آیا تھا۔ دونوں وہی نیم کے نیچے پتّل میں کھانے لگے ۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا ۔ دیکھو پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے ! یہ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے ؟ ٹامی نے دُم ہلا دی ۔" سریش کو اماں نے پالا تھا ؛ ٹامی نے پھر دم ہلا دی ۔' لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا ۔اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے !۔ ٹامی نے پھر دم ہلائی.

کتا اس کہانی میں ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ علامت ہے انتہائی ذلّت کی ۔سماج کچھ لوگوں کو اتنا ذلیل کرتا ہے کہ ان کو اچھوت بنا کر انہیں کتوں کی طرح جینے پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر بھی وہ اپنے آقاؤں سے کتوں ہی کی طرح وفادار رہتے ہیں اور ہر روٹی کے ٹکڑے کو ان آقاؤں کا کیا ہوا احسان سمجھ کر احساسِ تشکر کے ساتھ کھاتے ہیں ! کیسا دل ہلا دینے والا المیہ ہے ! پریم چند کیوں نہ لڑتے کیسے نہ لڑتے اس گھناؤنے سماجی نظام کے خلاف ۔لیکن پریم چند نے اسے محض جذباتی مسئلہ نہیں بنایا اور نہ صرف مذہبی ۔ وہ سماجی اور معاشی عوامل پر بھی نظر رکھتے تھے اور انہوں نے اس مسئلے کی اصلی ماہیت کا پتہ لگا لیا تھا۔ ہندو مذہب ذات پات کا نفسیاتی سطح پر شعور دیتا ہے لیکن اس شعور کو فعال بناتا ہے ہمارا سماجی اور معاشی نظام جس میں اعلیٰ طبقے اور ذاتیں سستی مزدوری سے دولت پیدا کر کے اس پر اپنا حق جما لیتی ہیں ۔

www.taemeernews.com

9

1930ء کے بعد اپنی زندگی کے آخری دور میں پریم چند کو آدرش واد کھوکھلا نظر آنے لگا۔ وہ ساری زندگی غریبوں، محنت کشوں اور اچھوتوں کے لیے لڑتے آئے تھے۔ لیکن ان کی یہ لڑائی انسان دوستی اور آدرش واد کی بنیادوں پر تھی، طبقاتی بنیادوں پر نہیں۔ لیکن اب انہیں احساس ہونے لگا کہ انسان دوستی اور آدرشوں کی اپیل طاقتور مفاد پرستوں کے دلوں کو چھو بھی لے تو انہیں اپنے ان مفادات سے دستبردار ہونے پر مجبور نہیں کر پاتی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، پریم چند نے اپنے شاہکار ناول "گئودان" میں رائے صاحب کا کردار پیش کر کے اس بات کو اچھی طرح جتایا ہے۔ اب وہ سماجی نظام کے طبقاتی کردار کو اچھی طرح سمجھنے لگتے ہیں اور سماج میں جاری طبقاتی لوٹ کھسوٹ کے میکانزم کو سائنٹفک بنیادوں پر اپنی تخلیقات میں پیش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ "گئودان" میں کھنا کے کردار کے ذریعے پریم چند نے سرمایہ دارانہ نظام کے طبقاتی کردار اور اس کی لوٹ کھسوٹ کی میکانزم کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔

کھنا رائے صاحب کو اُن کی کمپنیوں میں حصے خریدنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے:

"روپئے جتنے چاہیں مجھ سے لیں۔ بیشک آپ کا ہے۔ ہاں ابھی آپ نے اپنی زندگی

www.taemeernews.com

کا بیمہ نہ کرایا ہوگا۔ میری کمپنی کی ایک بڑھیا پالیسی لے لیجیے۔ سو دو سو ماہوار بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں اور بعد کو یکجائی رقم مل جائے گی۔ چار پانچ ہزار لڑکوں کے لیے اس سے بہتر بندوبست آپ نہیں کر سکتے۔ ہمارے قواعد دیکھیے۔ ہم باہمی امداد کے اصولوں پر پورا عمل کرتے ہیں۔ دفتر اور عملے کے خرچ کے سوا نفع کی ایک پائی بھی کسی کی جیب میں نہیں جاتی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اس طریقے پر کمپنی کیسے چل رہی ہے اور میری صلاح سے تھوڑا سا ٹے کا کام شروع کر دیجیے۔ یہ جو آج صدہا کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں سب اسی کی بدولت بنے ہوئے ہیں۔ روئی، شکر، گیہوں، ربر کسی جنس کا سٹا کیجیے۔ منٹوں میں لاکھوں کا نپٹارا ہوتا ہے۔ کام ذرا بے تکا ہے۔ بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں مگر وہی جو اناڑی ہیں۔ آپ جیسے تجربہ کار تعلیم یافتہ اور دور اندیش لوگوں کے لیے تو اس سے بہتر نفع کا کام ہی نہیں ہے۔ بازار کا چڑھاؤ اتار کوئی ناگہانی واقعہ نہیں۔ یہ بھی ایک سائنس ہے۔ ایک بار اُسے غور سے دیکھ لیجیے تو کیا مجال کہ دھوکا ہو جائے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند سرمایہ دارانہ نظام اور اس میں دولت مند بننے کے پینتروں پر پوری نظر رکھتے تھے۔ اس نظام میں دوسروں کا استحصال کر کے دولت مند بننا ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ انسانیت، عزتِ نفس، دوستی اور مروت کے لیے اس نظام میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ کھنا رائے صاحب کے بہترین دوستوں میں سے تھے مگر جب وہ ایک بڑے سنکٹ میں پھنس کر مسٹر کھنا کی بینک سے قرض لینے کے لیے بڑی امیدیں لے کر جاتے ہیں تو کھنا ٹکا سا جواب دیتے ہیں۔ لیکن رائے صاحب جب بہت ہی منت سماجت کرتے ہیں تو کھنا صاحب دوستی، مروت سارے جذبات کو ٹھکرا کر ایک ہوشیار بزنس مین کی طرح رائے صاحب سے کہتے ہیں: "بینک کی

www.taemeernews.com

جو حالت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے رکھدی۔ بینک نے ایک طرح سے لین دین کا کام بند کر دیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ساتھ خاص رعایت کی جائے۔ مگر کاروبار تو کاروبار ہی ہے، یہ آپ کو معلوم ہے۔ میرا کمیشن کیا رہے گا؟ مجھے آپ کے لیے خاص طور پر سفارش کرنی پڑے گی ....."

"رائے صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ کھنّا ان کے خاص دوستوں میں تھے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے بیٹھنے والے۔ اور وہ ان سے کمیشن کی امید رکھتے ہیں۔ اتنی بے مروتی! آخر وہ جو اتنے دنوں سے کھنّا کی خوشامد کرتے آئے ہیں، تو کس دن کے لیے؟ باغ میں پھل ہوں۔ ترکاریاں ہوں، سب سے پہلے کھنّا کے یہاں بھیجتے ہیں۔ کوئی جشن ہو، کوئی جلسہ ہو، سب سے پہلے کھنّا کو مدعو کرتے ہیں ۔ اس کا یہ جواب ہے!"

دراصل حقیقت یہ ہے کہ نہ رائے صاحب کی دوستی کھنّا صاحب سے نہ کھنّا صاحب کی دوستی رائے صاحب سے خلوص اور بے غرضی پر مبنی ہے۔ دونوں کے اپنے مفادات ہیں ایک کے سرمایہ دارانہ اور دوسرے کے جاگیر دارانہ۔ ان کے آپسی رشتے میں خلوص، شرافت، مروّت کو کیسے دخل ہو سکتا ہے۔ ان کی تو سنکٹ میں پڑ کر محض دہائی دی جاتی ہے۔ پریم چند نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا اور اپنے اس دور کی تخلیقات و تحریروں میں وہ اس حقیقت کو پوری ایمانداری سے بے نقاب بھی کرتے ہیں۔ ادبی تخلیقات میں پوری فن کارانہ حسن کاری سے اور مضامین میں سائنٹفک معروضیت اور دلائل کے ساتھ۔ اپنے آخری دور میں انہوں نے "مہاجنی سبھیتا" (مہاجنی تہذیب) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون نظریاتی اعتبار سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

"مگر اس مہاجنی تہذیب میں سارے کاموں کی غرض محض پیسہ ہوتی ہے۔ کسی دیش پر راج کیا جاتا ہے، تو اس لیے کہ مہاجنوں یا سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔

www.taemeernews.com

اس نقطۂ نظر سے دیکھو تو آج دنیا میں سرمایہ داروں کی حکومت ہے۔ انسانی معاشرہ دو طبقوں میں بٹ گیا ہے۔ بڑا حصہ مرنے اور کھپنے والوں کا ہے، اور چھوٹا حصہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اپنی طاقت اور اثر سے بڑے طبقے کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ انہیں اس بڑے طبقے سے کسی طرح کی ہمدردی نہیں، ذرا بھی رورعایت نہیں۔ بڑے طبقے کی ہستی صرف اس لیے ہے کہ اپنے آقاؤں کے لیے پسینہ بہائے، خون گرائے اور ایک دن چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔"

پریم چند کو اس بات پر بڑا افسوس ہے کہ حکمراں طبقوں کے یہ خیالات محکوم طبقوں پر بھی اثر کر گئے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر فرد اپنے آپ کو سماج سے علیحدہ تصور کرتا ہے اور وہ شکاری جانور بن کر سماج کو اپنا شکار سمجھتا ہے۔ اس کا سماج سے ایک ہی رشتہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کس طرح کوئی ایسی ترکیب سجھائی دے تاکہ وہ اُسے بے وقوف بنا کر جتنا ممکن ہو سکے پیسہ بٹور لے، اسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ پیسوں کی لالچ نے تمام انسانی احساسات کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ پیسہ اور صرف پیسہ ہی ہمارا سماجی مرتبہ، ہماری بھلائی اور ہماری قابلیت طے کرتا ہے۔ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو آپ دیوتا بن سکتے ہیں چاہے آپ کا دل کتنا ہی کالا کیوں نہ ہو۔ ادب، موسیقی، فن۔ سبھی کو دھن کے دیوتا کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ دولت نے ہماری فضا کو اتنا ملوث کر رکھا ہے کہ اس میں سانس لینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس مہاجنی تہذیب میں پریم چند لکھتے ہیں، پیسوں نے انسان کے دل و دماغ پر ایسا غلبہ حاصل کر لیا ہے کہ اس کی حکمرانی پر کسی بھی زاویے سے حملہ کرنا خطرناک نظر آتا ہے۔ انسان جو ایک زمانے میں محبت، رحم، سچائی اور شرافت کا زندہ مجسمہ سمجھا جاتا تھا اب بے جان نیکا نرم بن کر رہ گیا ہے جسے رحم اور شفقت سے کوئی واسطہ نہ رہا ہو۔ اس مہاجنی تہذیب نے نئے قوانین اور نئے مفروضے بنائے ہیں جن کے مطابق آج سماج کا کاروبار چلایا جا رہا ہے۔ ایسا ایک مفروضہ

www.taemeernews.com

ہے : 'وقت پیسہ ہے'۔ ایک وقت ایسا تھا کہ وقت زندگی تھا اور اس کا بہترین استعمال علم و تہذیب کے حصول اور غریبوں اور امداد کے مستحق لوگوں کی خدمت میں صرف کرنا تھا۔ آج کل اس کا بہترین استعمال اسے پیسہ کمانے پر خرچ کرنا سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی انگلیاں مریض کی نبض پر ہوتی ہیں مگر اس کی آنکھیں گھڑی پر چپکی رہتی ہیں۔ ہر منٹ اس کے لیے اتنا پیسہ ہے۔ اگر مریض نے اسے ایک روپیہ ادا کیا ہے تو اسے ایک منٹ سے زیادہ وقت نہیں دیا جا سکتا.... وہ جیسے تیسے نسخہ لکھ دوسرے مریض کو دیکھنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوتا ہے..... پیسے کے اس مذہب نے دوستی اور انسانیت کو بے معنیٰ بنا دیا ہے۔ شوہر کے پاس اپنے بیوی بچوں کے لیے ہی وقت نہیں ہے، دوستوں اور عزیزوں کا تو ذکر ہی چھوڑیے۔ جتنا وقت وہ ان کے ساتھ بات کرنے میں گذارے گا وہ اسے پیسہ کمانے پر خرچ کر سکتا ہے۔ زندگی کے اُسی صورت میں کچھ معنیٰ ہیں جب وہ اسے کچھ کمانے پر خرچ کرے ورنہ سب تضیعِ اوقات ہے۔

اس تہذیب کا دوسرا مفروضہ ہے : بزنس بزنس ہے، اس میں انسانی احساسات اور جذبات کا کیا دخل۔ زندگی کے پُرانے اصول ایسی بے رحمانہ بے باکی۔ جسے بے شرمی ہی کہنا چاہیے۔ اور جو اس نئے اصول کی زندگی اور روح ہے، کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جب ہم پیسوں کی، نقد روپوں کی بات کر رہے ہوں تو ہم دوستی اور انسانیت کا کوئی لحاظ نہیں کر سکتے۔ بزنس میں دوستی کو کیا دخل.... اس مَہاجنی تہذیب کے ان تمام نئے اصولوں میں 'بزنس بزنس ہے'، والا اصول سب سے زیادہ مہلک اور خون کا پیاسا اُصول ہے۔ شوہر اور زن کے درمیان بزنس، باپ اور بیٹے کے درمیان بزنس، معلم اور متعلم کے درمیان بزنس! انسانوں کے درمیان تمام روحانی رشتے نابود ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی رشتہ رہ گیا ہے تو وہ اس بزنس کا رشتہ ہے۔ جہنم میں جائے یہ بزنس۔

www.taemeernews.com

اس مہاجنی تہذیب سے پریم چند کو جتنی نفرت ہے وہ اس مضمون سے ظاہر ہے۔ لیکن انسانیت کے مستقبل سے وہ بالکل مایوس نہیں ہیں۔ اسی مضمون میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں:

"ایک نئی تہذیب کا سورج دور مغرب سے طلوع ہو رہا ہے، جس نے اس سرمایہ داری کی جڑ کھود کر پھینک دی ہے۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے جسم و دماغ سے محنت کر کے کچھ پیدا کر سکتا ہے۔ حکومت اور سماج کا قابلِ احترام رکن ہو سکتا ہے اور جو صرف دوسروں کی محنت یا باپ دادا کے جوڑے ہوئے دھن پر رئیس بنا پھرتا ہے، وہ قابلِ نفرت انسان ہے۔ اسے نہ معاملاتِ حکومت میں رائے دینے کا کوئی حق ہے، نہ شہریت کے حقوق لینے کا۔ سرمایہ دار اس نئی لہر سے بوکھلایا ہوا پھر رہا ہے اور ساری دنیا کے سرمایہ داروں کی مشترکہ آواز اس نئی تہذیب کو کوس رہی ہے۔"

پریم چند اس نئی تہذیب کے خلاف سرمایہ دارانہ سازشوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں: یہ انفرادی آزادی کی دشمن ہے۔ یہ انسان سے مذہب اور ضمیر کی آزادی کا حق چھین لیتی ہے۔ روزانہ نئے نئے الزام تراشے جاتے ہیں، نئے نئے لوم لگائے جاتے ہیں اور اسے کالے رنگ سے پوتا جا رہا ہے۔ لیکن پریم چند کا اٹل فیصلہ ہے کہ:

"مبارک ہے وہ تہذیب جو امیر آدمی کی حکومت کا خاتمہ کر رہی ہے اور نجی ملکیت کا۔ جلد یا بدیر دنیا کو اسی کے نقشِ قدم پہ چلنا ہوگا۔ یہ کہنا کہ یہ نظام اِس یا اُس ملک کے سماجی اور مذہبی حالات کو راس نہیں آتا یا اِس یا اُس ملک کی فضا کے مطابق نہیں ہے، بیہودہ بات ہے ..... ہاں، مہاجنی نظام اور اس کے کرائے کے چاکر اس کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنے پر اپنا سارا زور صرف کریں گے، عوام کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہو جائے فتح

www.taemeernews.com

تو سچائی کی ہی ہوگی "

ان حالات سے صاف ظاہر ہے کہ پریم چند سوشلسٹ نظام کو انسانیت کے لیے بہترین نظام تسلیم کر چکے تھے اور یہ کوئی سطحی طور پر نہیں بلکہ پورے غور و فکر کے بعد اور صدق اور خلوص کے ساتھ. اور دن بدن اس نئے نظام پر ان کا ایمان مضبوط ہوتا گیا اور تادمِ آخر اس میں کوئی فرق نہیں آیا. اپنے آخری ناول " منگل سوتر " میں جسے وہ مکمل نہ کر سکے، انہی خیالات پر زور دیا ہے۔ وہ اس ناول کے صرف چار ابواب ہی لکھ سکے۔ ان ابواب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ "گئودان" کے آگے کی چیز تھی اور اس ناول میں وہ انسانی معاشرے کے بنیادی مسائل کو بالکل نئے زاویے سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ " شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دیو کمار جیسے معمر ادیب اور مفکر کو ناول کا ہیرو بنایا ہے۔ وہ ایک دانشور ادیب ہے۔ متعدد کتابوں کا مصنف ہے اور ساری زندگی ادب کی خدمت کرتا رہا ہے ... وہ صرف قومی مسائل پر غور نہیں کرتا بلکہ کل بنی نوع انسان کے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ سب کو ایک سطح پر خوش حال اور آسودہ دیکھنا چاہتا ہے " دراصل یہ پریم چند پر سوشلسٹ تہذیب اور اس نئے نظام کے وژن کا ہی نتیجہ ہے۔

دیو کمار کو ہر طرف بے انصافی، بے ایمانی اور لوٹ کا بازار گرم نظر آتا ہے تو اس کا دردمند دل پکار اٹھتا ہے :

"کہاں ہے نیائے؟ کہاں ہے؟ ایک غریب آدمی کسی کھیت سے بالیں نوچ کر کھا لیتا ہے. قانون اسے سزا دیتا ہے۔ دوسرا امیر آدمی دن دہاڑے دوسروں کو لوٹتا ہے اور اسے پدوی ملتی ہے۔ سمان ملتا ہے .... ہاں دیوتا ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہے ہیں۔ انہیں اب بھی سنسار دھرم اور نیتی پر چلتا ہوا نظر آتا ہے .... لیکن انہیں دیوتا کیوں کہو کایر (بزدل) کہو۔ سوارتھی اور آتم سیوی (خود غرض اور مطلبی) کہو .... یہاں دیوتا بننے کی ضرورت نہیں ہے .... دیوتاؤں ہی میں نہیں منشوں میں منش (انسانوں میں انسان)

www.taemeernews.com

بننا پڑے گا۔ دردروں (غریبوں) کے بیچ میں ان سے لڑنے کے لیے ہتھیار باندھنا پڑے گا۔ ان کے پنجوں کا شکار بننا دیوتا پن نہیں گراوٹ ہے۔"

اس ناول کے ان چار ابواب سے اب یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ پریم چند عدم تشدد کے قائل نہیں رہے تھے اور تشدد کے مقابلے میں وہ تشدد کا استعمال ضروری سمجھنے لگے تھے۔ "منگل سوتر" کا ہیرو دیو کمار (دراصل ایک طرح سے یہ پریم چند کی ہی اپنی آتم کتھا ہے۔) ظلم اور بے انصافی سے سمجھوتا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔ روحانیت پر سے بھی اس کا اعتقاد متزلزل ہو چکا ہے۔ عقل اور استدلال ہی کی حکمرانی وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ دیو کمار کا کردار یوں بیان کرتے ہیں۔ (اور گویا اپنے دل ہی کی بات کہتے ہیں) :

"پنڈت دیو کمار کو دھمکیوں سے جھکانا تو ناممکن تھا مگر عقلی دلائل کے سامنے ان کی گردن آپ ہی آپ جھک جاتی تھی۔ ان دنوں وہ یہی پہیلی سوچتے رہتے تھے کہ دنیا میں یہ بدحالی کیوں ہے ..... روحانیت سے ان کی گتھی نہ سلجھتی تھی۔ اگر ساری کائنات ایک اتم (خودی یا روح) کی مظہر ہے تو پھر یہ تفریق کیوں ہے ..... کیوں ایک آدمی سخت سے سخت محنت کر کے بھی بھوکوں مرتا ہے اور دوسرا آدمی ہاتھ پاؤں نہ ہلا کر بھی پھولوں کی سیج پر سوتا ہے ..... عقل کہتی ہے یہاں سب ہی آزاد ہیں۔ سب کو اپنی صلاحیت اور امکانات کے لحاظ سے ترقی کرنے کا حق ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ سب کو برابر کا موقع کہاں نصیب ہے۔ بازار لگا ہوا ہے جو چاہے وہاں سے اپنی خواہش کے مطابق چیز خرید سکتا ہے مگر خریدے گا تو وہی جس کے پاس پیسے ہیں اور جب سب کے پاس پیسے نہیں ہیں تو سب کا برابر حق کیسے مانا جائے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کو ان کے آخری دور میں یہی سوال ستا رہا ہے کہ نابرابری، ظلم اور

www.taemeernews.com

جبر اور لوٹ اور کھسوٹ کو کیسے ختم کیا جائے۔ وہ اپنے قاری کو اس کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور ان بے انصافیوں سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ادیب اور قلم کار کے لیے سماج داد کی اہمیت جتانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

1936ء میں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد کی اور پریم چند سے اس کی صدارت کی درخواست کی۔ پریم چند نے بخوشی صدارت قبول کی اور اپنا تاریخی صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس کے چند مہینوں کے بعد ہی پریم چند کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے یہ خطبہ ان کے آخری دنوں کی یاد ہے اور ایک نامور ادیب کی حیثیت سے یہ ایک طرح سے ان کا ادبی وصیت نامہ ہے۔ اس کا ذکر یہاں اس لیے ضروری ہے کہ آنے والی نسل کے کئی ادیبوں کے لیے یہ مشعل راہ بنا اور اس لیے بھی کہ اس میں ادب اور ادیب سے متعلق پریم چند کے پختہ خیالات کا اظہار ہے، وہ خیالات جن پر عمر کے اس آخری دور میں اُن کو پورا یقین تھا۔ ادب کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> "ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو، یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانۂ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستانِ خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتتی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلّم تھا۔ قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعراء پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انہیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعراء اپنی جدت

www.taemeernews.com

اور جولانی دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی بندش یا نئی تشبیہ یا نئی پرواز کا ہونا داد پانے کے لیے کافی تھا۔ چاہے وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔"

اُس دور کے ادب برائے ادب کی اس طرح تنقید کرنے کے بعد پریم چند ادب اور زندگی کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :

" ادب اپنے زمانہ کا عکس ہوتا ہے۔ جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں وہی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانے میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصوف اور ویراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں۔ جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوہ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجاتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔"

ادب کے فنکشن پر روشنی ڈالتے ہوئے پریم چند اپنے اس خطبے میں بڑی اہم بات کہتے ہیں :

"اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمّے لے لی ہے اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوقِ حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو، کوئی ادیب نہیں جس میں یہ احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ احساس جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوتِ احساس کے ذریعے اس میں جذبۂ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہیے وہ

www.taemeernews.com

انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علم بردار ہے جو پامال ہیں مظلوم ہیں محروم ہیں چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور عدالت اس کے احساس حق اور انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کر کے اپنی کوشش کو کامیاب سمجھتا ہے مگر عام وکلا کی طرح وہ اپنے موکل کی جانب سے جا و بے جا دعوے پیش نہیں کرتا۔ مبالغے سے کام نہیں لیتا۔ اختراع نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔"

ادیب کو اس کے فرائضِ منصبی یاد دلا کر پریم چند حسن اور اس کے بدلتے ہوئے معیار سے بحث کرتے ہیں کیونکہ حسن کاری ہر ادیب کا بنیادی عمل ہے۔ حسن کاری اور جذبات کی تہذیب یہ اس کے بنیادی فرائض میں شامل ہیں لیکن حسن کا معیار بھی طبقاتی عصبیت کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے حسن کے تصور سے بحث کرنا ایک ترقی پسند ادیب کے لیے بے حد ضروری ہے۔ پریم چند اس سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے۔ شفق کی سرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں ہماری روح کیوں کھل اُٹھتی ہے؟ اس لیے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے، سنگیت دل کشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ تخریب

www.taemeernews.com

نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے۔ زندگی ہے۔ جہاں ان کا فقدان ہے، وہیں افتراق خود پروری ہے اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری زندگی کی علامتیں ہیں۔"

وہ آرٹ کی افادیت کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں اور اس میں پریم چند کو قطعاً کوئی تامل نہیں:

" مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں، بے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوشنما نظارہ ہے، کہیں اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم اس لیے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی امید ہوتی ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی اسی لیے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں نمو اور تقویت ملتی ہے۔"

لیکن پریم چند حسن کے معیار کو اضافی قرار دیتے ہوئے اسے بدلنے پر زور دیتے ہیں:

" ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں

www.taemeernews.com

کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں، جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے انہیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا اگر کبھی وہ ان کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اڑانے کے لیے اس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لیے..... اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی کہ وہ کش مکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فاقہ اور عریانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے۔ اسے وہ شاید تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لیے حسن حسین عورت میں ہے۔ غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی منڈیر پر سُلائے پسینہ بہا رہی ہے..... لیکن یہ اس کی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہِ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے گا کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں کی آڑ میں اگر نخوت، اور خود آرائی اور بے حسی ہے تو ان مرجھائے ہوئے ہونٹوں اور کمہلائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار، اور عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔"

پریم چند اپنے خطبے میں ادب کے ایک اور اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ادب طبعاً ترقی پسند ہوتا ہے اور سماج میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے:

"ترقی پسند مصنفین کا عنوان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو وہ شاید ادیب نہ ہوتا۔ وہ ادیب یا آرٹسٹ ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔ وہ اپنی تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اسے نظر نہیں آتی۔ اس لیے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے۔ وہ ان ناخوشگوار حالات کا خاتمہ

www.taemeernews.com

کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا جینے اور مرنے کے لیے بہتر جگہ ہو جائے۔ یہی درد اور یہی جذبہ اس کے دل و دماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے۔ اس کا حساس دل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت و رسوم کی قیود میں پڑ کر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب مہیا کیے جائیں کہ وہ غلامی اور عسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند ادب میں ذمہ داری کے قائل تھے اور وہ ادب کو ایک بہتر اور مبنی بر انصاف معاشرہ وجود میں لانے کا احساس دلانے کے لیے استعمال کرنا نہ صرف جائز تصور کرتے تھے بلکہ ایسا کرنا نہایت ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ اپنے خطبے کے آخری پیراگراف میں صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیتے ہیں:

"بہرحال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا گا سُلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا، اس وقت تک ادیب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

ان کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پریم چند ادب میں محض رومانویت کے قائل نہ تھے نہ ہی وہ ادب کو سستی تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ادب وہی زندہ ادب کہلائے گا جو ہمارے اندر عمل کی روح پھونکے، آزادی کا جذبہ بیدار کرے۔ لیکن پریم چند کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ محض نعرے بازی سے ادب میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ حسن کاری ادب کا اتنا ہی بنیادی فریضہ ہے جتنا کہ عمل کی تحریک

www.taemeernews.com

دینا صحیح ذوقِ حسن کے بغیر یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی ۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اس خطبۂ صدارت میں پریم چند نے ترقی پسند ادب کا ایک واضح تصور دیا ہے، ایک ایسا تصور جو آج بھی بے انصافیوں، ظلم اور استحصال کے خلاف جدوجہد میں مصروف ادیبوں کے لیے لائحہ عمل پیش کرتا ہے ۔ ایسا تصور جو ہمیں ادب کو محض تفریح یا سماج سے کٹے ہوئے فرد کی داخلی فریاد بنانے سے بچاتا ہے ۔

www.taemeernews.com

10

پچھلے صفحات میں ہم نے پریم چند کے خطبے میں ان کے فنی نظریات سے ان ہی کے الفاظ میں واقفیت حاصل کی ۔اب ہم ان کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر اُن کے فن کا اجمالی جائزہ لیں گے ۔یہاں ان کے فن کا تفصیلی جائزہ لینا یا ان کی تخلیقات کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔اسی لیے ہم چند اہم تصنیفات کو سامنے رکھ کر اُن کے فن پر اجمالی گفتگو کر سکیں گے۔

جدید کہانی کے ارتقا میں پریم چند کا اہم حصہ ہے اس سے شاید ہی کوئی نقاد انکار کی جرأت کر سکے گا۔ یہ حصہ کس قدر اہم ہے اس بات پر البتہ اختلاف ہو سکتا ہے ۔ یقیناً پریم چند کے بعد کہانی اور ناول کے فن نے بہت کچھ ترقی کی ہے اور فنی اور تکنیکی اعتبار سے کئی بہتر کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پریم چند کی اہمیت جدید کہانی کی تاریخ میں اپنی جگہ مسلّم ہے ۔پریم چند نے کہانی کے فن کو محض داستان یا افسوں طرازی کے چنگل سے نکال کر ایک نئے راستے پر ڈال دیا اور اسے زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر کر دیا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو اور ہندی کہانی کو پریم چند نے جدید فکشن کی دنیا میں ایک باعزت مقام دلایا۔ پریم چند پہلے اہم ادیب ہیں جنھوں نے اردو فکشن کو حقیقت نگاری سے روشناس کرایا۔

www.taemeernews.com

حقیقت نگاری کی اصطلاح کو واضح کر دینا ضروری ہے۔ دراصل یہ تصور ہم نے یورپی ادب سے لیا ہے۔ یہ انگریزی اصطلاح Realism کا ترجمہ ہے۔ یورپی ادب میں ایک دور میں رومانیت کا دور دورہ تھا۔ رومانوی طرزِ تحریر ظاہر ہے تخیل اور اس کی پرواز پر زیادہ زور دیتا ہے، معروضی حقیقت پر نہیں۔ لیکن 19 ویں صدی سے یورپ میں بعض ادیبوں نے اس تخیل پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور ادب میں معروضی حقیقت کی عکاسی پر زور دینا شروع کیا۔ ان ادیبوں کے لیے حقیقت نگاری کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ ظاہر ہے ان ادیبوں کا زور محض تخیل کی پرواز کے مقابلے میں زندگی کے حقائق کی عکاسی پر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی تخلیقات میں تخیل کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اگر ادب میں تخیل کا عمل دخل نہ ہو تو وہ محض فوٹو گرافی ہو کر رہ جائے گا۔ فوٹو گرافی ایک میکانکی عمل ہے، اور ادب ایک تخلیقی عمل اور تخلیقی عمل تخیل کی مدد کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ بعض ادیب انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں اور تکنیک کو تخلیقی عمل پر زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ رومانیت کے خلاف بھی احتجاج اس وقت شروع ہوا جب ادب محض تخیل کی پرواز کا نام رہ گیا اور معروضی حقیقت کو قطعاً نظر انداز کیا جانے لگا۔ اسی طرح بعض حقیقت نگاروں نے ادب کو محض فوٹو گرافی بنا کر رکھ دیا۔ اچھے تخلیقی عمل میں معروضی حقائق کا اور تخیل کا بڑا متوازن امتزاج ہوتا ہے۔

ہم اوپر کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ شروع میں پریم چند خود رومانیت کے زیرِ اثر لکھتے تھے۔ ان کی تخلیقات بھی داستان طرازی اور قصہ گوئی کے دائرے تک محدود تھیں۔ لیکن پریم چند نے بہت جلد اس طرزِ تحریر کی محدودیت کو محسوس کر لیا اور "سوزِ وطن" کی کہانیاں ان کے لیے ایک نیا ادبی موڑ بن گئیں۔ سوزِ وطن کی کہانیوں میں پریم چند نے حقیقت نگاری کی سمت پہلا قدم بڑھایا اور اسی لیے پریم چند کے ادبی ارتقا میں "سوزِ وطن" کی اپنی اہمیت ہے۔ ایک مرتبہ پریم چند نے حقیقت نگاری کی سمت قدم بڑھایا پھر پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ دراصل یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس سمت میں اپنا فن پختہ تر کرتے چلے گئے۔ بلکہ یہ

www.taemeernews.com

کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ حقیقت نگاری سے سماج وادی حقیقت نگاری تک پہنچے۔ یہاں چند لفظوں میں حقیقت نگاری، انتقادی حقیقت نگاری اور سماج وادی حقیقت نگاری کا فرق واضح کر دینا بھی ضروری ہوگا۔ حقیقت نگار وہ ہے جو معروضی حقائق کی اپنی تخلیقات کے ذریعے عکاسی کرے جبکہ انتقادی حقیقت نگار وہ ہے جو سماج میں پائی جانے والی طبقاتی تقسیم اور اُس سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور معاشی ناانصافیوں کا واضح شعور رکھتا ہو اور ان خرابیوں اور ناانصافیوں سے پیدا ہونے والے انسانی کرب کو کامیابی کے ساتھ اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کر سکے۔ اس کے برخلاف سماج وادی حقیقت نگار وہ ہے جو نہ صرف طبقاتی سماج اور اُس سے پیدا ہونے والی ناانصافیوں اور انسانی کرب کا شعور رکھتا ہو بلکہ وہ اس طبقاتی سماج کو بدل کر ایک غیر طبقاتی سماج وجود میں لانے کا بھی شعور رکھتا ہو۔

پریم چند نے ان ارتقائی منازل کو یکے بعد دیگرے طے کیا۔ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو وہ داستان طرازی اور تخیل پرستی کے اثر میں تھے۔ اس مرحلے سے گذر کر وہ حقیقت نگاری کی طرف آئے اور بہت جلد انہوں نے برطانوی سامراج کے زیرِ حکومت ہندوستانی سماج میں پائی جانے والی خرابیوں اور معاشی نابرابری سے پیدا ہونے والے مسائل کا شعور حاصل کر لیا۔ ان کے اس دور کے اکثر افسانوں اور ناولوں میں انتقادی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ گویا اب پریم چند انتقادی حقیقت نگاری کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ شروع ہی سے پریم چند کو مظلوم اور محکوم طبقوں سے ہمدردی تھی۔ ادبی کیریر کے اپنے اس دور میں اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے بھرپور طریقے سے ان طبقوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُن کے شاہکار "گئودان" میں ہمیں اس طبقاتی شعور کی واضح جھلک ملتی ہے۔ "گئودان" میں دراصل پریم چند سوشلسٹ ریلزم کے قریب آتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گئودان ان کی انتقادی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔ البتہ ان کا آخری ناول "منگل سوتر" جو نامکمل ہی رہا ان کا سب سے اہم ناول ہوتا اور شاید سوشلسٹ ریلزم کی مثال بھی۔ لیکن موت نے انہیں مہلت

www.taemeernews.com

نہ دی اور اس ناول کو وہ مکمل نہ کر سکے۔ جیسا کہ مہاجنی تہذیب والے مضمون سے اور ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں دیے گئے خطبۂ صدارت سے ظاہر ہے وہ عمر کے اس مرحلے میں سوشلزم کے مکمل حامی ہو چکے تھے اس لیے یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس ناول (یعنی منگل سوتر) میں ضرور غیر طبقاتی سماج کی تفہیم سے بحث کرتے اور اس طرح سوشلسٹ ریلزم کی تکنیک کو اپناتے۔

جہاں تک انتقادی حقیقت نگاری کا تعلق ہے اس کی بہترین مثالیں ہمیں پریم چند کے یہاں ملتی ہیں۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اس کی بڑی نکھری ہوئی صورت ہمیں ان کے یہاں نظر آئے گی۔ ان کے دورِ اوّل کی کہانیوں اور ناولوں کو چھوڑ دیا جائے تو پریم چند کے ناول ہمیں محض نظریاتی کے مقابلے میں ٹھوس، یک طرفہ کے بجائے کئی جہتوں والے، ٹھہرے ہوئے کے بجائے ارتقا پذیر اور مابعد الطبیعیاتی کے مقابلے میں تاریخی یعنی وقت کو حقیقی تسلیم کرنے والے نظر آئیں گے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک انتقادی حقیقت نگار کے یہاں ان خصوصیات کا پایا جانا بے حد ضروری ہے۔

بعض لوگوں نے حقیقت نگاری کو فوٹو گرافک تکنیک یا معروضی حقیقت کی جوں کی توں عکاسی کرنا سمجھ لیا ہے۔ ایسے ادیبوں کے یہاں حقیقت نگاری کا اتنا محدود تصور قائم ہو گیا کہ اس میں میکانکی عکاسی کے علاوہ کسی اور تکنیک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی۔ لیکن یہ پریم چند کی عظمت کا ثبوت ہے کہ ہمیں ان کے یہاں حقیقت نگاری کا ایسا میکانکی تصور نہیں ملتا۔ حقیقت وہی نہیں ہے جیسا ہم اسے پاتے ہیں بلکہ وہ ایک بدلتا ہوا اور بدلنے والا عمل بھی ہے، ایک نئی ابھرتی ہوئی حقیقت کا تصور بھی۔ خود پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے: "میں حقیقت پسند نہیں ہوں (اسی میکانکی معنیٰ میں)۔ کہانی میں چیز جیوں کی تیوں رکھی جائے تو سوانح عمری ہو جائے گی۔ دست کار کی طرح ادیب کا حقیقت پسند ہونا ضروری نہیں ہے، وہ ہو بھی نہیں سکتا۔ ادب کی تخلیق گروہ انسانی کو آگے بڑھانے اٹھانے کے لیے ہوتی ہے.... مثالیت ضرور ہو لیکن حقیقت پسندی اور فطری انداز کے برعکس نہ ہو۔ اس طرح حقیقت

www.taemeernews.com

پسند بھی مثالیت کو نہ بھولے تو بہتر ہے "۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ پریم چند حقیقت نگاری کو فوٹو گرافی یا سوانح عمری کے معنیٰ میں تسلیم نہیں کرتے بلکہ انسان اور انسانی سماج کو اٹھانے اور آگے بڑھانے کے معنیٰ میں مانتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ حقیقت کی طرف انتقادی رویہ اختیار کرنا اور تبدیلی کے عمل پر زور دے کر ابھرتی ہوئی حقیقت کو، جو انسان کے ظاہر و باطن کو زیادہ حسین اور صحت مند بنائے، اپنی تخلیقات میں پیش کرنا ہی صحیح معنیٰ میں حقیقت نگاری کے زمرے میں شامل ہے اور یہ حقیقت نگاری زیادہ جاندار اور ماضی اور مستقبل سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہوتی ہے۔

یہاں فن کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو بڑا اہم ہے اور حقیقت نگاری کی ایک اور سطح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ادیب محض موجود سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ امکانی حقیقت کا بھی ایک تصور قائم کرتا ہے اور اس کی تخلیقات میں ہمیں موجود اور امکانی حقیقت میں ٹکراؤ اور تناؤ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ زندگی سے متعلق ادیب کا اپنا ایک وژن ہوتا ہے اور اس وژن کے پیشِ نظر موجودہ حقیقت اُسے غیر اطمینان بخش نظر آتی ہے اس لیے وہ ایک امکانی دنیا کا تصور قائم کرتا ہے جہاں ہر بات اُس کے وژن کے مطابق اور اطمینان بخش ہوگی۔ موجودہ حقیقت اُسے بدصورت نظر آتی ہے، اور اسے وہ اپنی تخلیقات میں زیادہ بدصورت بنا کر پیش کرتا ہے اور امکانی دنیا کو اور زیادہ خوبصورت تاکہ موجود اور امکان میں تناؤ پیدا ہو۔ یہ تناؤ جتنا شدید ہوگا اس کی تخلیق کی جمالیاتی کیفیت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ پریم چند بھی اس بات کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ وہ ادب کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ ذہنی انکشاف کا اور جذبات کی تطہیر کا بھی۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

> " ادب سے حاصل ہونے والی تفریح میں جذبات کی تطہیر کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اگر تطہیر کا مقصد سامنے رکھا جائے تو کشف کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم داخلی ذہنی کیفیت دکھاتے ہیں اس لیے نہیں کہ ہمیں کوئی فلسفہ پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم

www.taemeernews.com

خوبصورت کو اور خوبصورت اور بدصورت کو اور بدصورت بنا سکیں۔"

دراصل یہی ایک فن کار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ بدصورت موجودہ حقیقت اور خوبصورت امکان میں شدت سے تناؤ پیدا کرے اور اپنے قاری کی داخلی کیفیت کو بھرپور طریقے سے متاثر کرے تاکہ اس پر ایک نئی حقیقت کا، جو کہ امکانی حقیقت ہے، انکشاف ہو جائے اور اس بات کو پریم چند ادب کے مقاصد میں شامل کرتے ہیں۔

پریم چند نے ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جب ہندوستان ایک زبردست بحرانی دور سے گذر رہا تھا۔ برطانوی حکومت نے صدیوں پرانے ہندوستانی سماج میں نئے پیداواری رشتے اور ایک حد تک نئی پیداواری طاقتوں کو جنم دے کر حرکت پیدا کر دی تھی۔ یہ ماضی کی طرح محض حکمرانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی، برطانوی حکومت نے ایک نئے سماجی نظام کو بھی جنم دیا تھا۔ پریم چند کی دوربین نگاہوں نے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ ایک کامیاب ادیب کے لیے سماجی تبدیلی کے عمل اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر گہری نظر رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور سے ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ان میں ان مسائل کو سمونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پریم چند اس راز سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی تیز بیں نگاہیں سماجی تبدیلی کے عمل اور اس سے پیدا شدہ دیہاتی ہندوستان میں پائے جانے والے تضادات اور دیہاتوں میں رہنے والے مفلس عوام کی داخلی زندگی میں خام مواد تلاش کرتی ہیں۔ ہندوستان کی اصل طاقت کا سرچشمہ انہیں دیہات کے ان مفلس عوام میں نظر آیا جو اپنی زندگی میں معمولی سی خوشگواری کی تمنا اپنے سینوں سے لگائے آخر موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ "گئودان" میں ہوری ایک ایسا ہی کردار ہے۔ ہوری کی ایک چھوٹی سی تمنا جو روایتی معاشرے میں ہر ہندوستانی کسان کی ہوتی ہے یعنی کہ ایک گائے حاصل کرنے کی تمنا۔ یہ تمنا ہوری کی زندگی کی جدوجہد کا محور ہے اور پریم چند اس ناول میں دیہاتی زندگی کے تمام تضادات اور تلخیوں کو بھرپور طریقے سے اُجاگر کر دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

جمالیات کے کئی اہم اجزاء ہیں اور ایک حرکی اور بدلتے ہوئے سماج کے مختلف مسائل کو جب تخلیقی ادب کا موضوع بنایا جاتا ہے تو یہ بات خاصی اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ جمالیات کے کن عناصر پر زور دیا جائے۔ جب ایک سماج تبدیلی کے عمل سے دوچار ہوتا ہے تو کئی انسان اس عمل سے مختلف طریقوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب برطانوی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی اور نئی معاشی اور سماجی قوتیں وجود میں آئیں تو ان سے کروڑوں عوام متاثر ہوئے۔ شہروں میں برطانوی کارخانوں کا مال درآمد ہونے لگا اور لاکھوں چھوٹے بڑے دستکار اس سے تباہ ہو گئے، اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ دیہاتوں میں برطانوی رعیت واری نظام نے دیہات کے قدیم خود مختار کردار کو تباہ کر کے جاگیردارانہ نظام کو ایک نئی شکل دی جس سے غریب کسانوں کے استحصال میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان تبدیلیوں سے پرانے سماجی اور انسانی رشتے بھی متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے لاکھوں عوام کو اس عمل نے اپنی زد میں لیا اور پرانے نظامِ حیات اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے نے اس دور کے متاثرہ عوام میں کرب اور بے چینی کی کیفیت پیدا کی۔ پریم چند کے کردار انہی متاثرہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے افسانوں اور ناولوں میں تبدیلی کے اس عمل سے پیدا ہونے والے کرب کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل جمالیات کا یہ بڑا ہی مشکل اور پیچیدہ پہلو ہے اور اس سے وہی پوری ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کی سماجی تبدیلیوں کی تہ در تہ پیچیدگیوں پر پوری گرفت ہو۔

پریم چند سماجی حالات اور اس میں پیدا ہونے والے تبدیلی کے عمل پر جو گرفت رکھتے تھے وہ ان کے ناول "گئودان" سے خاص طور سے ظاہر ہے۔ "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" بھی اچھے ناولوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن ان ناولوں میں اکثر کردار پریم چند کے نظریات کا شکار نظر آتے ہیں۔ "چوگانِ ہستی" کے سورداس اور "میدانِ عمل" کے امرکانت دونوں کی یہی کمزوری ہے۔ جبکہ "گئودان" میں ہوری ہو یا رائے صاحب، کھنّا ہو یا مہتا، حالات کی پیچیدگیوں اور سماجی عمل سے ان کے کرداروں کا

www.taemeernews.com

خمیر اٹھتا ہے ۔ اور اسی میں فن کار کی پختگی ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ "گئودان" میں خامیاں نہیں ہیں۔ اس میں بھی کئی جھول ہیں اور میلو ڈرامہ بھی ۔ کئی موڑ مصنوعی بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے اہم کردار تہ در تہ پیچیدگی رکھتے ہیں اور فن کار کی پختگی کی ہم سے داد وصول کرتے ہیں ۔ دراصل اس ناول کے تانے بانے میں وہ تمام سماجی ۔ سیاسی اور معاشی قوتیں گتھی ہوئی ہیں جن کے مجموعے کا نام ہندوستانی دیہات ہے (اس میں ان کے تضادات اور ٹکراؤ بھی شامل ہیں ۔) کوئی عظیم فن کار ان طاقتوں اور ان کے تضادات اور ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل کو نظر انداز کر کے بڑا ناول نہیں لکھ سکتا ۔

جمالیات کا اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ فن کار اپنے کردار کے کرب یا مسرت کا کس طرح زیادہ سے زیادہ پُراثر طریقے سے اظہار کرے ؟ دوسرے لفظوں میں اظہار کا مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا ہے ۔ کیا علامتوں سے اس کا اظہار کیا جائے یا فنطاسیہ کے ذریعے ؟ بیانیہ طریقہ اپنایا جائے یا شعور کی رو جیسی تکنیک ؟ دراصل موثر اظہار کا کوئی واحد ذریعہ نہیں ہو سکتا اور صرف زبان پر قدرت بھی اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی. بعض ماہرینِ جمالیات کا خیال ہے کہ فن کار کا کمال یہ ہے کہ اظہار کے لیے اپنی زبان میں جذباتی شدت پیدا کرے ۔ لیکن مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے ۔ بعض مراحل اظہار کے ایسے ہوتے ہیں کہ محض جذبات کی شدت اور اس کے لسانی اظہار سے کام نہیں چلتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں علامت ، استعارے ۔ فنطاسیہ وغیرہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے کیونکہ بعض وقت کرب ناکی کو عام بول چال کی زبان کے الفاظ برداشت نہیں کر سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں جب شدید سماجی اور سیاسی بحران پیدا ہوا تو ادیبوں اور فن کاروں کے سامنے اظہار کا مسئلہ پیدا ہوا کہ اس بحران سے پیدا ہونے والے شدید انسانی کرب کو تخلیقی ادب کے ذریعے کس طرح پیش کیا جائے ۔ اسی ادبی بحران کے پیشِ نظر دادا ازم ۔ سرریلزم ، شعور کی رو جیسی تکنیکوں کی ابتدا ہوئی ۔ ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ بعض ادیبوں نے زندگی اور سماج کی طرف منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے ان تکنیکوں کو اپنایا ۔ بہرحال بنیادی

www.taemeernews.com

مسئلہ تو اظہار کا ہی تھا۔ تکنیک بذاتِ خود اچھی یا بُری قدروں کی نمائندہ نہیں ہوتی۔ وہ تو محض اظہار کا ذریعہ ہے۔

پریم چند کے یہاں ہمیں ان تکنیکوں کا استعمال نہیں ملتا۔ ان کے یہاں سیدھا سادا اظہار کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے۔ پریم چند کے دور میں ہندوستان میں سیاسی اور سماجی بحران ضرور پایا جاتا تھا مگر اس کا مقابلہ یورپ میں جنگ عظیم سے ہونے والی ہلاکت خیزیوں اور اس کے سماجی بحران سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یورپ کے لیے تو وہ سرمایہ داری کے زوال اور اس کے اصلی کردار اور اس کی سفاکیوں کی بے نقابی کا دور تھا۔ امپریلیسٹ طاقتیں آپس میں لڑ رہی تھیں اور تمام انسانی قدروں کو تباہ کر رہی تھیں۔ ہندوستان اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ جاری تھی اور نئی معاشی قوتوں کے تحت اس کے معاشرے میں دھیرے دھیرے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن یورپ کی طرح ہندوستان جنگ کی تباہ کاریوں کا بلاواسطہ شکار نہیں تھا۔ اسی لیے پریم چند کے سامنے اظہار کا مسئلہ اپنی پوری سفاکی اور شدّت کے ساتھ نہیں آیا اور انہوں نے حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کرتے ہوئے یورپی اسالیب کے برخلاف سیدھا بیانیہ انداز اختیار کیا۔ لیکن چونکہ خارجی حالات اور سماجی تبدیلی کی پوشیدہ اور پیچیدہ طاقتوں پر ان کی گرفت تھی اس بیانیہ انداز کے باوجود انہوں نے ہمیں بعض ایسی تخلیقات دیں جن کو عالمی ادب میں مقام دیا جاسکتا ہے۔

لیکن ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ پریم چند خارجیت پسند ہیں، کردار کے اندر جھانک کر بہت کم دیکھتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں ہمیں داخلی تصادم کی شدّت بہت کم دکھائی دیتی ہے، سماجی اصلاح پر ان کی نظر جمی رہتی ہے اور سماجی برائیوں کو وہ خوب ابھارتے ہیں لیکن اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں اور روحانی اذیتوں کو وہ بہت کم ابھار پاتے ہیں۔ بیدی کے افسانے "بُلاوان"، میں دھوبی کے لڑکے کے کردار میں جو داخلی کرب ابھر کر آتا ہے وہ ہمیں پریم چند کے نیچی ذات کے کرداروں میں بہت کم ملتا ہے۔ ان کے ہریجن کرداروں میں وہ تلخی اور اظہار کی شدّت بھی نہیں پائی جاتی جو ہمیں دلت ادب میں

www.taemeernews.com

نظر آتی ہے ۔ ہریجنوں کی ذِلّت اور بے بسی اور سماج میں بے عزّت ہونے کا تلخ ترین احساس اور اس کا شدید ترین اظہار ہمیں نام دیو ڈھال کی "گول میٹھا" والی نظموں یا دیا پوار کی آتم کتھا "بلوتے" میں ملے گا۔ اس کا عشر عشیر بھی ہمیں پریم چند کے ہریجن کرداروں میں نہیں ملتا۔ یہ مسئلہ ان کے یہاں دکھ جھیلنے سے زیادہ سماجی اصلاح کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ حقیقت نگاری کا ایک پہلو ۔ اور بہت اہم پہلو ۔ یہ بھی ہے کہ کہانی کار خارجی واقعات سے پیدا ہونے والے داخلی تصادم ، نفسیاتی پیچیدگیوں ، روحانی کرب وغیرہ کا بھی کامیابی سے اظہار کرے اور یہیں سے اظہار کا بھی مشکل ترین مسئلہ شروع ہوتا ہے ۔

اظہار اگر بہت تلخ ہو جائے تو کلبیت کی حدوں کو چھونے لگتا ہے اور بعض سماجی حقائق کا اظہار اس تلخ نوائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا ۔ اس معنیٰ میں پریم چند کی کہانی "کفن" حقیقت نگاری کا بڑا کامیاب نمونہ ہے ۔ افلاس کی انتہا اور اس سے پیدا ہونے والے ذہنی رویّے اور روحانی کیفیت کا بڑا موثر اظہار ہے جس میں مفلسوں کی دنیا کے بے رحم حقائق کو جذبۂ ترحم کے تحت نہیں بلکہ بڑے ہی بے رحمانہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور اسی بے رحمانہ اظہار نے اس افسانے کو طاقت ور بنایا ہے ۔ جذبۂ ترحم کتنا ہی قابلِ تعریف کیوں نہ ہو، اگر وہ مصنف پر حاوی ہو جاتا تو یہ افسانے کی بڑی کمزوری ثابت ہوتا ۔ یہاں پریم چند مسئلے کو سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے ، بلکہ حقیقت کی سنگینی کو بغیر کسی رو رعایت کے جیسی پاتے ہیں پیش کر دیتے ہیں ۔ اخلاقی تصوّر، انسانی اقدار کچھ بھی ان کے آڑے نہیں آتا ۔ کلبیت کی انہی حدوں کو چھوکر وہ ہندوستان کے دیہات کی حقیقت کو پا جاتے ہیں اور جسے پڑھ کر قاری میں جذبۂ ترحم پیدا نہیں ہوتا بلکہ اُسے اس پورے سماجی ڈھانچے سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہی نفرت انقلابی سمت میں پہلا قدم ہے ۔

ہو سکتا ہے بعض لوگ حقیقت نگاری کے اس پہلو کو محض کلبیت ، یا زندگی کی طرف منفی رویّہ قرار دیں لیکن یہ بات ایک خاص معنیٰ میں ہی صحیح ہو سکتی ہے ۔ اسے موجودہ سماجی حقیقت کی طرف اس قسم کا رویّہ

www.taemeernews.com

قرار دیا جاسکتا ہے اُس حقیقت کی طرف نہیں جس کا تصورِ فن کار کرتا ہے ۔ ارسطو فن سے جذبات کی تطہیر (Catharsis) کا کام لینا چاہتا تھا اور اگر فن کا یہ مقصود قرار پائے تو حقیقت کو ایک خاص انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے جس سے قاری یا ناظر کو کردار کی صورتِ حال سے جذباتی طور پر ہم آہنگی محسوس ہو۔ بریخت اس کے برخلاف فن سے اجنبیت کا احساس (Alienation effect) پیدا کرنے کا کام لینا چاہتا ہے اور میرے خیال سے حقیقت نگاری کی یہ زیادہ کامیاب تکنیک ہے ۔ کفن بھی Catharsis نہیں Alienation effect پیدا کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں نفی کی انتہا ہی اثبات کی ابتدا ہے ۔ پریم چند کا افسانہ کفن بھی نفی کی انتہا کو پہنچ کر ایک نئی حقیقت کا اثبات کرتا ہے جو موجودہ حقیقت کی طرح تلخ اور ناگوار نہیں ہے۔ انتقادی رویّے کی اسی انتہا کو پہنچ کر پریم چند ہمیں زندگی کا ایک نیا شعور دے جاتے ہیں لیکن یہ بات ان کی اس سے پہلے کی تخلیقات کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی ۔ جن میں اصلاح پسندی کا جذبہ طاری ہو جاتا ہے ۔

پریم چند کا رویّہ آزادیٔ نسواں کی جانب کچھ مبہم بھی ہے اور پیچیدہ بھی ۔ آج ہم اکثر مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات کی بات کرتے ہیں اور عورتوں کو ہر میدان میں مردوں کے مساوی حقوق دینا چاہتے ہیں ۔ پریم چند کھل کر اس قسم کی مکمل مساوات کی حمایت کرتے نظر نہیں آتے ۔ جہاں تک عورتوں پر مظالم اور زیادتیوں کا سوال ہے وہ سینہ سپر ہو کر ان کے لیے لڑتے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے بال وِدواہ کے خلاف اور بیوہ عورتوں کی شادی کے حق میں چلائی گئی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اسے اپنی کئی کہانیوں کا موضوع بھی بنایا۔ خود بھی، جیسا کہ کتاب کے شروع میں بتایا جا چکا ہے، دوسری شادی ایک بال وِدھوا سے کی ۔ وہ بیاہ شادی کے معاملے میں ذات پات کی تقسیم کو بھی تسلیم نہیں کرتے ۔ چنانچہ "گئودان" میں گوبر کی شادی جھنیا سے، جو ایک پنچ ذات کی لڑکی ہے، ہوتی ہے اور مصنف کی ہمدردی اس جوڑے کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی طرح ماتادین سلیا چمارن سے تعلقات قائم کرتا ہے اور آخر برہمن ہونے

www.taemeernews.com

کے باوجود اسی کے جھونپڑے میں آرہتا ہے۔ اسی طرح وہ اُن عورتوں سے بھی پوری ہمدردی رکھتے ہیں جو عصمت فروشی پر مجبور ہوتی ہیں اور اسے بھی اپنے ایک ناول "بازارِ حسن" کا موضوع بنایا ہے۔ اسی ناول میں انہوں نے جہیز کی گھناؤنی رسم پر بھی حملہ کیا ہے۔ دراصل جہیز کی لعنت ہی اس ناول کے مرکزی کردار سمن کو بازارِ حسن کی زینت بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سمن پر اس گھناؤنے پیشے کی خرابیاں جب ظاہر ہوتی ہیں تو وہ اس تعفن زدہ ماحول سے پدم سنگھ اور بٹھل داس کی ہمدردی اور سہارے سے ودھوا آشرم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پریم چند نے اس ناول میں طوائفوں کی اصلاح کی راہ میں جو کٹھنائیاں ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔

لیکن پریم چند مغربی ممالک کی طرح عورتوں کی غیر محدود آزادی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ انہیں ایک فرض شناس گھریلو بیوی اور ایثار کی دیوی کے روپ میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے تو پریم چند نے عام طور پر اور بلا تفریقِ جنس ایثار اور قربانی کو تکمیلِ ذات کا ذریعہ قرار دیا ہے، لیکن عورتوں میں وہ اس جذبے کو خاص طور پر ابھارنا چاہتے ہیں۔ "گئودان" میں مالتی اور مہتا کی محبت میں یہی پہلو جلوہ گر ہے اور میدانِ عمل میں سکھدا اور سکینہ دونوں ہی اس جذبے کی آئینہ دار ہیں لیکن سکینہ میں یہ جذبہ سکھدا سے بڑھ کر ہے اور اسی لیے امرکانت کا رُخ سکینہ کی طرف ہے۔ سکھدا کہتی ہے:

"میرے دل میں تو کبھی تسلیم کی یہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میں ان سے ہنس کر بولنے اور اپنے حسن و شباب کی نمائش ہی میں پڑی رہ گئی۔ نہ کبھی پریم کیا نہ کبھی پریم پایا۔ مجھے برسوں میں جو چیز نہ ملی وہ اسے (سکینہ کو) منٹوں میں مل گئی۔"

ان کے ناول "نرملا" کا مرکزی کردار نرملا بھی ایثار اور قربانی کا کردار ہے۔ وہ نوعمر ہے اور اس کی شادی طوطارام سے ہوتی ہے جو ایک بوڑھا وکیل ہے اور جوان بیٹے کا باپ ہے۔ لیکن نرملا اس دائم المریض بوڑھے وکیل کے ساتھ بھی ایک فرض شناس بیوی کی طرح سلوک کرتی ہے۔ وہ ساری زندگی محرومیوں کی

www.taemeernews.com

آگ میں سلگتی رہتی ہے لیکن کبھی حرفِ شکوہ زبان پر نہیں لاتی طوطارام جب اپنی جواں مردی کے اسے فرضی قصے سناتا ہے تو نرملا سوچتی ہے ....: بے چارہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ یہ سارا سوانگ صرف اسی لیے تو ہے کہ میں اپنا غم بھول جاؤں۔ آخر اب بھاگ تو بدل سکتا نہیں۔ اس بے چارے کو کیوں جلاؤں۔"

"گئو دان" میں مالتی بہت آزاد ہے۔ مردوں میں بڑی آزادی سے گھلتی ملتی ہے۔ اُن کا مذاق اڑاتی ہے، ان پر اپنی برتری جتاتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے مغرب زدہ ہے۔ لیکن آخر وہ مہتا کی محبت میں گرفتار ہو کر عورتوں کے متعلق اس کے خیالات کی قائل ہو جاتی ہے اور اپنی سطحی فیشن پرستی کو چھوڑ کر ایثار و قربانی کی مثال پیش کرتی ہے۔ مہتا جو عورتوں کے معاملے میں پریم چند کے ہی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے فیشن پرست اور مغرب زدہ عورت کو شراب اور فرض شناس گھریلو عورت کو پانی سے تشبیہ دیتے ہوئے کھنّا کی بیوی گوبندی سے کہتا ہے "شراب اگر لوگوں کو پاگل کر دیتی ہے تو کیا اُسے پانی سے بہتر سمجھا جائے جو پیاس بجھاتا ہے، جلاتا ہے اور تسکین دیتا ہے؟"، اسی طرح مہتا سے آزادیٔ نسواں کے جلسے میں پریم چند نے جن خیالات کا اظہار کرایا ہے وہ عورتوں سے متعلق دراصل ان کے ہی خیالات ہیں:

"اور یہ مردوں کی سازش ہے۔ عورتوں کو اونچی چوٹی سے گھسیٹ کر اپنے برابر بنانے کے لیے۔ اُن مردوں کے برابر جو بزدل ہیں، جن میں ازدواجی زندگی کی ذمے داری سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے جو آزادانہ نفس پرستی کی لہر میں سانڈوں کی طرح دوسروں کے ہرے بھرے کھیتوں میں منھ مار کر اپنی کمینہ خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں! مغرب میں ان کی سازش کامیاب ہو گئی اور عورتیں تتلیاں بن گئیں۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے کہ اس تیاگ اور تپسیا کی سرزمین ہندوستان میں بھی کچھ دنوں سے وہی ہوا چل رہی ہے۔ خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ بہنوں پر وہ جادو بڑی تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ وہ گرہست عورت کے دھرم کو چھوڑ کر تتلیوں کا رنگ پکڑ رہی ہیں۔"

www.taemeernews.com

دراصل پریم چند نے آزادیٔ نسواں کے جس تصوّر کی یہاں کردی تنقید کی ہے اس کا تعلق اعلیٰ طبقوں کی مغرب زدہ عورتوں سے ہے اور ان کی یہ تنقید اس نقطۂ نگاہ سے ایک حد تک حق بجانب بھی ہے ۔ کیونکہ اعلیٰ طبقوں کی ان فیشن پرست عورتوں نے آزادی اور مساوات کا بڑا ہی کھوکھلا تصوّر قائم کیا ہے وہ مساوات کی ذمے داریوں سے قطعاً بے پروا ہیں ۔لیکن پریم چند نے اوپری طبقوں کی فیشن پرست عورتوں کے تصوّرِ آزادی کو لے کر اپنی رائے قائم کر لی اور آزادیٔ نسواں اور جنسی مساوات کا محدود تصوّر بنا لیا ۔ عورتوں پر گھر کی تمام ذمے داریاں عائد کر کے انہیں گھر سے باہر کی دوسری سماجی ذمے داریوں اور حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔ خود ہندوستان میں بھی غریب طبقوں کی عورتیں آج بھی زندگی کی جدوجہد میں ہر طرح سے مردوں کی شریک ہیں ۔ خود پریم چند کے ایسے کردار وہ دھنیا ہو یا سلیا گھر سے باہر اپنی روزی روٹی کماتی ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہوتی ہیں ۔ صرف گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتیں ۔ دراصل پریم چند کا گھریلو عورت کا آئیڈیل ہندوستان کے اُس دور کے متوسط طبقے کا آئیڈیل تھا ۔

www.taemeernews.com

11

پریم چند کا انتقال 8 اکتوبر 1936ء کو ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 56 سال تھی۔ مالی مشکلات تفکرات اور علالت نے قبل از وقت اُن کو ہم سے چھین لیا۔ ابھی وہ اور جی سکتے تھے اور ہمیں اور ہماری تہذیب کو اپنی تخلیقات سے اور مالا مال کر سکتے تھے۔ وہ ہندوستان کو آزاد ہوتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکے۔ اُن کے انتقال کو آج 44 سال ہو چکے ہیں اور ہندوستان کو آزاد ہوئے 33 سال۔ کیا آج پریم چند نے اپنے دور میں جو کچھ لکھا وہ بے کار ہو چکا ہے؟ کچھ نقاد اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پریم چند کے بعد کہانی اور ناول کے فن نے کئی منزلیں طے کر لی ہیں اور پریم چند اور اُن کا فن بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ لیکن یہ ان نقادوں کا خیال ہے جو مواد کے مقابلے میں تکنیک اور ہیئت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک ادب کا سماجی تعلق اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ بے شک تکنیک کے اعتبار سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں کہانی کے فن نے ترقی کی ہے۔ آج ہم علامتوں اور استعاراتی پیرایہ کو بیانیہ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں، فنطاسیہ کا بھی استعمال مستحسن سمجھنے لگے ہیں۔ حقیقتوں کی پیچیدہ اور تہ در تہ ترجمانی اور داخلی کیفیات کی پیش کش میں ان باتوں سے ہمیں بہت مدد ملی ہے۔ اس دوران میں شہروں اور شہری آبادی میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور

www.taemeernews.com

پریم چند بستر مرگ پر

آج ہم صنعتی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کے جبر و استحصال کو پریم چند کے دور کے مقابلے میں زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں اور جدید افسانہ ہمارے اس نئے موڈ کو جو صنعتی شہروں کی جکڑبندیوں کی پیداوار ہے پیش کرتا ہے اور اسے ہم عصری حسیت کہتے ہیں۔

پریم چند کا زمانہ قدرے مختلف تھا۔ شہری تہذیب اور تیز رفتار زندگی کا دور دورہ نہیں تھا۔ نہ ہی صنعتی شہر میں پایا جانے والا بیگانگی کا جان لیوا احساس۔ اُس دور کے شہروں میں بھی اپنے پن کا احساس اور انسانی رشتوں کا احترام باقی تھا۔ لیکن اتنا کہہ دینا سب کچھ کہہ دینے کے برابر نہیں ہے۔ تبدیلی ہوئی ہے اور ہمارے ادب نے اس کی عکاسی بھی کی ہے لیکن یہ تبدیلی اتنی نہیں ہوئی ہے کہ پریم چند اور ان کی تخلیقات ہمارے لیے بے معنیٰ ہو کر رہ جائیں۔ یورپ اور امریکہ میں صنعتی تہذیب نے پوری

www.taemeernews.com

آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ وہاں صنعتی پیداوار 90 فیصد ہے اور زرعی پیداوار 10 فی صد۔ وہاں دیہاتوں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ہندوستان میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں آج بھی صنعتی پیداوار کی لپیٹ میں 20 فی صد سے زیادہ آبادی نہیں آسکی ہے۔ ہمارے شہروں کے مزدور اور محنت کش طبقے آج بھی دیہاتوں سے عضوی رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ ان کی تہذیب بھی دیہاتی تہذیب ہے۔ ہمارے متوسط طبقے آج بھی پرانی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ہمارے مذہب، اخلاق، طرزِ زندگی غرض ہر چیز پر آج بھی جاگیر دارانہ دور کے اثرات نمایاں ہیں۔ ذات پات کا مسئلہ، نچلی ذاتوں کو آئین میں چند حقوق اور تحفظات مل جانے کے باوجود بھی اتنا ہی گمبھیر ہے بلکہ طبقاتی جدوجہد کے ساتھ اس کی شدت میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

کیا آج بھی ہمارے دیہاتوں میں ہوری، مادھو اور گھیسو نہیں ملیں گے؟ کیا ہمارا غریب کسان آج بھی قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں ہے؟ ہمارے اخباروں میں آج بھی بندھوا مزدوروں کی خبریں چھپتی ہیں۔ بہار کے پلامو علاقے میں آج بھی آدی باسی کسان زمینداروں اور مہاجنوں کی صورت دیکھ کر اس طرح خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے ہیں جیسے کہ کسی شیر یا چیتے کو دیکھ لیا ہو۔ ہمارے دیہاتوں میں آج بھی ہریجنوں کو زندہ جلا دیا جاتا ہے اور پولیس اور سرکاری افسر خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ آج بھی ہماری عدالتوں میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ فرقہ وارانہ فسادات میں اتنا ہی وحشی پن ظاہر ہوتا ہے جتنا ملک کی تقسیم کے وقت یا اس سے پہلے ہوتا تھا۔ آخر کس اعتبار سے ہمارا سماج اتنا بدلا ہے کہ پریم چند کی کہانیاں اور ان کے ناول ہمارے لیے بے مصرف بن کر رہ جائیں؟ جب تک ہندوستان میں استحصال ہوتا رہے گا، جب تک چھوا چھوت کی لعنت باقی رہے گی، جب تک فرقہ وارانہ فسادات میں بے گناہ لوگ قتل کیے جاتے رہیں گے، جب تک بٹائی پر کھیتی ہوتی رہے گی اور بے زمین کسان کو اپنے حقوق نہیں ملیں گے "گئودان" ہمارے سماج کا نمائندہ ناول رہے گا اور پریم چند ہمارے لیے بامعنیٰ رہیں گے۔

www.taemeernews.com

آج طبقاتی شعور کی آنچ کچھ تیز ہوئی ہے، ہوری اب صرف تقدیر اور سماج کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد بھی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو اس شعور کی آنچ کو تیز کرنے میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی ہمت اور تحریک پیدا کرنے میں کہیں پریم چند کی تخلیقات کا بھی کچھ حصہ ہے۔ ابھی پریم چند کا مشن پورا نہیں ہوا بلکہ ان کے مشن کی آج زیادہ شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات میں ٹھیراؤ نہیں تھا، تاریخی شعور اور حرکت اور وہ بھی ارتقا پذیر حرکت کا احساس تھا۔ تاریخ اور حرکت کا یہی احساس ہمارے لیے بہت ضروری ہے اور پریم چند کی عظمت کا راز بھی اسی میں پنہاں ہے۔

राष्ट्रीय शैक्षिक अनुसंधान और प्रशिक्षण परिषद्

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL
RESEARCH AND TRAINING